ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

MAY - 1988

اعلان داخلہ

مدرسہ مصباح العلوم، چوکنیا، بستی، یوپی

مدرسہ مصباح العلوم، چوکنیا ایک دینی و عصری علوم کا مرکز نیز قابل اعتماد تربیتی درسگاہ ہے جہاں ابتدائی، ثانوی و عالی (اول تا عربی سوم) تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس وقت دارالاقامہ میں مقامی و بیرونی ملا کر ایک سو طلبا تعلیم و تربیت سے مستفید ہو رہے ہیں اور اسٹاف میں ۱۳ اساتذہ، ۵ کارکنان و ملازمین مصروف ہیں۔ مدرسہ نے تعلیمی، تعمیری و تربیتی امور میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ جامعۃ الفلاح بلریا گنج نے اپنے پرچوں کے ذریعہ امتحانات ممتحن کے زیر نگرانی انجام دلانے کی منظوری دے کر کے مزید تعلیمی استحکام بخشا ہے۔ مدرسہ میں جونیئر و اعلیٰ درجات میں وظائف دیئے جاتے ہیں جس کے متعلق جانکاری کیلئے داخلہ فارم و وظیفہ فارم طلب فرمائیں۔ داخلہ کی درخواست ۲۰ رمضان تک مدرسہ کے مطبوعہ فارم پر آجانی چاہیئے۔ سالانہ امتحان ۲۹ مارچ تا ۱۰ اپریل ۸۸ء ہوگا۔ طلبا اسی دن گھروں کو روانہ ہوں گے۔ دوبارہ مدرسہ بعد رمضان ۷ شوال کو جاری ہوگا۔

صدر مدرس: **مشتاق احمد فلاحی ایم اے**

پتہ: ناظم مدرسہ مصباح العلوم، چوکنیا پوسٹ بھارت بھاری ضلع بستی، یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۳ — شمارہ نمبر ۵

مئی ۱۹۸۸ء

مدیر مسئول — نور محمد فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

سالانہ زر تعاون	۳۰/ روپے
خصوصی تعاون	۱۰۰/ روپے
غیر ممالک سے	۱۵/ امریکی ڈالر
فی شمارہ	۳/ روپے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ حیات نو، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پریس، رائے جمال پریس دہلی — کاتب: رفیق احمد شاہ پوری

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ		
رمضان کا مہینہ بڑی برکتوں کا ہے	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۳
بحث ونظر		
مطالعۂ حدیث ۔ نیت اور عمل	جناب مولانا اقبال احمد قاسمی صاحب	۹
تشبیہ	جناب مفتی عبدالرؤف صاحب	۱۸
مقالات		
اسلامی فقہ اور اس کے جدید تقاضے	جناب مولانا الفتی رحمٰن صاحب ندوی	۲۴
عربی ادب	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۳۰
ابوالاعلیٰؒ کا شعری سرمایہ	جناب صباح الدین ملک فلاحی	۳۵
تجزیہ		
روس میں جنگ افغانستان کے اثرات	مترجم: جناب خورشید احمد شہابی صاحب	۴۴
وفیات		
الحاج کاکا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ	جناب مولانا محمد طاہر عمری مدنی صاحب	۵۲
شعر ونغمہ		
غزل	ثاقب	۵۸
غزل	ساحل بہارتی	۶۳
تعارف وتبصرہ		
علمۂ اسلام	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۵۷
جامعہ کے لیل ونہار		
۱۹۹۸ء کے فارغین جامعہ کو الوداعی پارٹی	ولی اللہ سعیدی فلاحی	۵۹

اداریہ

ولی اللہ سعیدی فلاحی

رمضان کا مہینہ بڑی برکتوں کا ہے

صوم اسلام کی عمارت کا ایک ستون ہے[1]۔ اس کی فرضیت کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے:

یاایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔[2]	اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کر دیئے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔

حدیث میں ہے:

عن طلحۃ بن عبید اللہ ان اعرابیا جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثائر الرأس فقال یا رسول اللہ اخبرنی ماذا فرض اللہ علی من الصلوۃ فقال الصلوات الخمس الا ان تطوع شیئا فقال اخبرنی ماذا فرض اللہ علی من الصیام فقال شہر رمضان الا ان تطوع شیئا الخ[3]	طلحہ بن عبید اللہ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا درانحالیکہ وہ پراگندہ بال تھا۔ اس نے کہا اے خدا کے رسولؐ! مجھے بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر کتنی نماز فرض کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا پانچ وقت کی نماز الا یہ کہ تم کچھ نفل کا اہتمام کرو۔ اعرابی نے پھر پوچھا اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر کتنا روزہ فرض کیا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا رمضان کا روزہ الا یہ کہ کچھ نفلی روزے تم رکھو۔[3]

---

[1] عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ واقام الصلوۃ وایتاء الزکوۃ والحج وصوم رمضان (صحیح البخاری۔ باب قول النبی بنی الاسلام علی خمس) [2] سورۃ البقرۃ ۱۸۳

باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ذکر، عبادت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی حیوانی و نفسانی خواہشات پراگندہ احساسات اور غیر اصلاحی جذبات سے یکسر خالی ہو کیونکہ یہی چیز انسانیت کی حقیقت ہے۔[1] لہٰذا حقیقت انسانی تک رسائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے روزے کو ایک اہم ذریعہ بنایا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

اعلم انه ربما يتفطن الانسان من قبل الهام الحق اياه ان سورة الطبيعة البهيمية تمده عما هو كماله من انقيادها للملكية فيبغضها ويطلب كسر سورتها فلا يجد ما يغنيه في ذلك كالجوع والعطش وترك الجماع والأخذ على لسانه وقلبه وجوارحه ويتمسك بذلك علاجا لمرضه النفساني۔[2]

جان لو کہ انسان اللہ تعالیٰ کے الہام کے ذریعہ کبھی کبھی یہ جان لیتا ہے کہ طبیعت بہیمیہ کی تیزی اس کو اپنے درجہ کمال یعنی ملکیت کے تابع ہونے سے روکتی ہے تو انسان اس پر ناراض ہوتا ہے اور بہیمیت کی تیزی کو توڑنا چاہتا ہے تو اس میدان میں بھوک و پیاس برداشت کرنے، ترک جماع کرنے اور زبان و قلب اور اعضاء و جوارح پر پابندی لگانے کے مقابلے میں کسی دوسری چیز کو اپنا مددگار و معاون نہیں پاتا تو وہ ان چیزوں کو اپنی نفسانی بیماری کا علاج سمجھ کر اس پر کاربند ہو جاتا ہے۔

اسی چیز کو قرآن لعلکم تتقون سے تعبیر کرتا ہے یعنی لعلکم تتقون به عن المعاصي و غير ذلك تاکہ تم روزہ کو برائیوں کے مقابلے میں سپر بناؤ۔ حدیث میں ہے: الصيام

گزشتہ صفحہ کا بقیہ: [2] صحیح البخاری جلد اول کتاب الصوم باب وجوب صوم رمضان الخ ص۲۵۴

[3] یہ حدیث میں ہے۔ اعرابی نے صیام کے بعد زکوٰۃ کے سلسلے میں پوچھا اور اسکے بعد کہا کہ میں ان سے زیادہ کروں گا اور نہ کم، تو آپ نے فرمایا کہ وہ کامیاب ہو گیا اگر وہ اپنے قول کو سچ کر دکھائے۔

[1] روزہ شہوت کو ختم کرتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص شادی نہ کر سکے وہ روزہ رکھے کیونکہ یہ روزہ شہوت کی شدت کو توڑتا ہے۔ ملاحظہ ہو مسلم جلد ۱ کتاب النکاح باب استحباب النکاح الخ ص۴۴۹

[2] ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ، المبحث الرابع، باب حقیقۃ السعادۃ ص۵۴

[3] کتاب مذکور، باب اسرار الصوم ص۴۲

جنة[1] روزہ ڈھال ہے۔ پھر روزے کو ماہ رمضان میں مختص کرنے کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی:

شهر رمضان الذي انزل فيه القرآن هدى للناس وبينت من الهدى والفرقان فمن شهد منكم الشهر فليصمه۔[2]

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا جو شخص اس مہینے کو پائے لازم ہے کہ روزہ رکھے۔[3]

یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر خاص رحمت ہے کہ وہ جب کوئی چیز فرض کرتا ہے تو محض فرض ہونے کی حیثیت سے اس کا بدلہ اجر ہی نہیں دیتا بلکہ اس فرض کی راہ میں تشجیع و تشویق سے کام لے کر مزید اجر میں اضافہ کرتا ہے کیونکہ یہ اس کی رحمت و شفقت کا عین تقاضہ ہے۔[4] اسی طرح روزے کا معاملہ ہے۔ عام دنوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے اجر میں خوب اضافہ کیا ہے اور اس کے لئے مزید نئی راہیں پیدا کی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے:

عن ابي هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الصيام جنة فلا يرفث ولا يجهل فان امرؤ قاتله او شاتمه فليقل اني صائم مرتين والذي نفسي بيده

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ ڈھال ہے۔ روزے میں کوئی شخص فحش گوئی و جہالت کی باتیں نہ کرے اور اگر کوئی شخص اس سے لڑائی جھگڑا کرے تو وہ اس سے کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں دو مرتبہ۔ اور قسم ہے اس ذات کی

---

[1] ملاحظہ ہو صحیح البخاری جلد اول باب فضل الصوم ص۲۵۴۔ [2] سورۃ البقرۃ ۱۸۵

[3] آگے آیت میں معذورین کے بارے میں اس فرض کی ادائیگی کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

[4] آپ اسلام کے کسی بھی رکن کو لے لیں۔ مثال کے طور پر نماز جو تمام پر فرض ہے۔ اب اللہ تعالیٰ نے نماز کی راہ میں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اجر عظیم رکھا ہے۔ وضو کے لئے پانی حاصل کرنا، وضو کرنا، مسجد کے لئے قدم اٹھانا، مسجد میں داخل ہونا، غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ اپنے بندوں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا ہے۔

لخلوف فم الصائم اطيب عند الله من ريح المسك يترك طعامه و شرابه و شهوته من اجلي الصيام لي وانا اجزي به والحسنة بعشر امثالها۔ ۱

جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے روزے دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک سے بھی زیادہ عمدہ ہے کیونکہ وہ اپنا کھانا پانی اور شہوت اللہ کیلئے چھوڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا روزہ میرے لئے ہے میں ہی اسکا اجر دونگا اور روزے میں نیکیاں دس گنا اجر کے ساتھ ہیں۔

ایک دوسری حدیث ہے:

عن ابی هريرة عن النبي صلی الله عليه وسلم قال (وفي آخر الحديث) من صام رمضان ايمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه۔ ۲

ابوہریرہؓ سے مروی ہے جس شخص نے رمضان کا مہینہ روزہ رکھا ایمان کی حالت میں اور ثواب حاصل کرنے کی خاطر تو اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

مزید برآں اس مہینے کی اہمیت و فضیلت اس حدیث سے واضح ہوتی ہے:

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم اذا كان اول ليلة من شهر رمضان صفدت الشياطين ومردة الجن وغلقت ابواب النيران فلم يفتح منها باب وفتحت ابواب الجنة فلم يغلق منها باب وينادي منادي يا باغي الخير اقبل ويا باغي الشر اقصر ولله

ابوہریرہؓ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب ماہ رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور خبیث جن جکڑ دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور اس کا کوئی بھی دروازہ کھولا نہیں جاتا اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس کا کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا اور پکارنے والا فرشتہ پکارتا ہے اے خیر کے چاہنے والے آگے بڑھ اور اے شر کے

۱ صحیح البخاری جلد اول باب فضل الصوم ص۲۵۴

۲ صحیح البخاری جلد اول۔ باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا ونیۃ الخ ص۲۵۵۔ اسی طرح کے الفاظ ترمذی میں بھی ہیں۔ ملاحظہ ہو ترمذی شریف ص۹۶

عتقاء من النار وذالك كل ليلة۔ ۱

چاہنے والے پیچھے ہٹ اور اللہ تعالیٰ جہنم سے لوگوں کو نجات دیتا ہے اور یہ ہر رات ہوتا ہے۔

ماہ رمضان سراپا عبادت ہے۔ ہر روزہ روزہ رکھنا تو عبادت ہے ہی اور اس کا ثواب اپنی جگہ مسلّم تو ہے ہی پھر مزید اعتکاف کے ذریعہ اللہ نے نیکی کا ایک بہترین ذریعہ اور فراہم کر دیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف فرماتے تھے۔ حدیث میں ہے:

عن عبد الله بن عمر قال كان رسول الله صلی الله عليه وسلم يعتكف العشر الاواخر من رمضان۔ ۲

عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے انھوں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف فرماتے تھے۔ ۳

قالت عائشة كان رسول الله صلی الله عليه وسلم يجتهد في العشر الاواخر ما لا يجتهد في غيره۔ ۴

عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے دوسرے عشروں کے مقابلے میں آخری عشرے میں کافی محنت کرتے تھے۔

پھر مزید آخری عشرے میں لیلۃ القدر کو اگر کلید گنجینۂ اجر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

انا انزلناه في ليلة القدر۔ وما ادراك ما ليلة القدر۔ ليلة القدر خير من الف شهر۔ تنزل الملائكة والروح فيها باذن ربهم من كل امر۔

ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔

۱ الجامع الترمذی باب ما جاء فی فضل شہر رمضان ص۹۶

۲ صحیح البخاری جلد اول۔ باب الاعتکاف فی العشر الاواخر والاعتکاف فی المساجد کلہا ص۲۷۱

۳ ترمذی میں عائشہؓ کے واسطے سے یہ حدیث مروی ہے اس میں "حتی قبضہ اللہ" زیادہ ہے۔ الجامع الترمذی۔ باب ما جاء فی الاعتکاف ص۹۹

۴ مسلم۔ جلد اول۔ باب الاجتہاد فی العشر الاواخر ص۳۷۲

سلٰمٌ ھی حتی مطلع الفجر [1]

وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس رات کی اہمیت کے پیش نظر خود بھی عبادت میں مشغول رہتے اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیتے تھے۔ ایک حدیث یہ ہے:

عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجاور في العشر الاواخر من رمضان ويقول تحروا ليلة القدر في العشر الاواخر من رمضان [2]

عائشہؓ سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اللہ تعالیٰ سے مجاورت اختیار کرتے تھے اور کہتے تھے رمضان کے آخری عشرے میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل وعیال کو بھی اس رات کی عبادت کی طرف ترغیب دیتے۔

عن علي ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يوقظ اهله في العشر الاواخر من رمضان [3]

علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں عبادت کیلئے اپنے اہل وعیال کو جگاتے تھے

مذکورہ بالا احادیث سے ماہ صیام کی عظمت، اہمیت اور اس کی فضیلت واضح ہوتی ہے۔ یہ مہینہ نیکیوں کی بہار کا مہینہ ہے [illegible] بہت محروم ہے جو اس کو خود اپنے ہاتھوں میں [illegible] ہے۔ ہم تمام مسلمان اپنا جائزہ لیں کہ ہم اس اہم فرض کی تکمیل اور اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اس کی تکمیل میں کہاں تک کامیاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام کو ماہ صیام کی برکتوں سے بیش از بیش استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ●●

---

[1] سورۃ القدر ۵-۱۔ [2] مزید تفصیل کیلئے: مسلم، باب فضل لیلۃ القدر [illegible] بخاری جلد اول ص ۲۶۹

[3] الجامع ترمذی، باب ماجاء فی لیلۃ القدر ص [illegible] اسی طرح [illegible] بخاری جلد اول ص ۲۷۰

مزید تفصیل کیلئے بخاری جلد اول باب فضل لیلۃ القدر ص ۲۷۰

[4] باب العمل فی العشر الاواخر من رمضان ص [illegible] مسلم جلد اول باب الاجتہاد فی العشر الاواخر [illegible]

نیت اور عمل

جناب مولانا اقبال احمد قاسمی صاحب، استاذ جامعۃ الفلاح

عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول انما الاعمال بالنيات وانما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته الى الله ورسوله، فهجرته الى الله ورسوله، ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها او امرأة يتزوجها فهجرته الى ما هاجر اليه

(متفق عليه)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور آدمی کو اس کی نیت کے مطابق ہی اجر ملے گا، تو جس شخص نے اللہ کی رضا اور اسکی خوشنودی کی طلب میں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری کے جذبے کے تحت ہجرت کی ہوگی اسکی ہجرت واقعی اور صحیح معنی میں اللہ اور رسول کی طرف ہوگی، یقیناً وہ اللہ اور رسول کا سچا مہاجر ہوگا اور قیامت کے روز اسکو اس ہجرت کا بہترین اجر وثواب ملیگا، اور جس نے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کیلئے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی خاطر ہجرت کی ہوگی اسکی ہجرت دنیا یا عورت ہی کیلئے ہوگی، وہ خدا اور رسول کی طرف نہیں ہوگی اور آخرت میں وہ اس ہجرت کے لئے کسی اجر وثواب کا مستحق نہیں قرار پائے گا۔

یہ حدیث ذخیرہ احادیث کی اہم ترین حدیثوں میں شمار کی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ گرچہ اس حدیث کا متواتر لفظی ہونا مختلف فیہ ہے مگر اس کے متواتر معنوی ہونے پر تقریباً اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں دو مختلف حوالوں سے بیس چھبیس صحابہ اور صحابیات کا نام بنام ذکر کیا ہے جن سے اس مفہوم کی متعدد احادیث مختلف کتب حدیث میں مروی ہیں۔ مثلاً

"یبعثون علی نیاتھم" (مسلم عن ام سلمۃؓ) "لکن جہاد و نیۃ" (بخاری، مسلم عن ابن عباسؓ) "من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ" (بخاری، مسلم عن ابی موسیٰؓ) "رب قتیل بین الصفین، اللہ اعلم بنیتہ" (احمد عن عبداللہ بن مسعودؓ) "من غزا وھو لا ینوی الا عقالا فلہ ما نوی" (نسائی عن عبادۃ الصامت) فتح الباری ج ۱، ص ۱۲۔

پس منظر اس حدیث کا یہ ہے کہ ایک شخص نے ام قیس نامی ایک عورت کو نکاح کا پیغام دیا۔ اس نے جواب دیا کہ اگر تم ہجرت کرکے یہاں مدینہ آجاؤ تو میں تمہارے ساتھ نکاح کرنے پر آمادہ ہوں۔ چنانچہ وہ شخص اس سے نکاح کی غرض سے مکے سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچ گیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا نام قیلہ تھا مگر وہ عام طور سے مہاجر ام قیس کے نام سے مشہور تھا اور تمام لوگ اس کو اسی نام سے جانتے تھے۔ محدثین نے عہد رسالت کے اس خاص شخص کو اس حدیث کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص موقع پر یہ بات فرمائی تھی، مگر اس کا حکم عام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ خاص شخص تو پردۂ خفا میں چلا گیا جس کے متعلق یہ بات کہی گئی تھی۔ البتہ یہ حدیث ہر اس شخص پر چسپاں ہوتی ہے جس میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔ حدیث کا مقصد مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ عمل کی مقبولیت و مردودیت کا حقیقی مدار نیت پر ہے۔ خدائے قدوس کی بارگاہ میں صرف وہی اعمال صالح اور لائق اجر قرار پائیں گے جو خلوص نیت کے ساتھ خالصۃً لوجہ اللہ کیے گئے ہوں۔ جو اعمال کسی دنیاوی غرض کے تحت فاسد نیت کے ساتھ کیے گئے ہوں گے وہ نہ تو خدا کے دربار میں "صالح" ہوں گے، نہ قابل قبول و لائق اجر و ثواب ٹھہریں گے، خواہ وہ بظاہر کتنے ہی صالح اور عظیم نظر آتے ہوں۔

خداوند تعالیٰ عمل کے ساتھ دل کو اور اعضاء و جوارح کے ظاہری اعمال و حرکات کے ساتھ دل کے اندر پوشیدہ اور موجزن جذبات و محرکات سے بھی پوری طرح واقفیت اور آگاہی رکھتا ہے۔ اس کی نگاہ میں اصل قدر و قیمت اشکال و اجسام کی نہیں، قلوب و نیات کی ہے۔ اس کی بارگاہ میں شرف قبولیت وہاں اجسام و ابدان اور اموال و اعمال کو نہیں، خلوص و تقویٰ اور اخلاص و للہیت کو حاصل ہوگی۔

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم (حج: ۳۷)

خدا کے حضور تمہاری قربانیوں کے گوشت پہنچتے ہیں نہ ان کے خون بلکہ اس کی بارگاہ میں تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

ان اللہ لا ینظر الی صورکم واموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم (مسلم عن ابی ہریرۃؓ)

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

خدائے علیم و خبیر کی نظریں سب سے پہلے انسان کے دل کو دیکھتی ہیں اور اس کے اندرون کو ٹٹولتی ہیں کیونکہ دل ہی اچھے برے اور پسندیدہ و ناپسندیدہ جذبات و احساسات کا سرچشمہ ہے۔ صالح یا غیر صالح اعمال و حرکات کا صدور انہی اچھے برے جذبات و رجحانات کے تحت ہوتا ہے اور نیکی و بدی کے سوتے اسی سرچشمہ سے پھوٹتے ہیں۔ پھر وہ آدمی کے اعمال پر نظر ڈالتا ہے۔ دل اگر درست نہیں ہے، اگر اچھے اعمال کی پشت پر بھی تقویٰ اور صالح جذبات کی تحریک موجود نہیں ہے تو بڑے سے بڑا عمل اور جمالیہ جیسا عظیم دنیاوی کارنامہ بھی خدا کی نظر میں ایک ذرۂ حقیر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور خلوص و للہیت کے جذبے سے عاری بڑے سے بڑے صاحب مال و اقتدار شخص کو خدا کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں حاصل ہوگا۔

انہ لیاتی الرجل العظیم السمین یوم القیامۃ لا یزن عند اللہ جناح بعوضۃ اقرءوا فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا۔ (مسلم عن ابی ہریرۃؓ)

قیامت کے دن ایک بڑا موٹا تازہ آدمی آئے گا لیکن وہ مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا ہوگا۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھو۔ ہم قیامت کے دن انھیں کوئی وزن نہیں دیں گے۔

دل کی درستگی اور اس کا خلوص ہی آدمی کی اصل پونجی اور اس کا حقیقی سرمایہ ہے۔ اسی کے ذریعہ سے اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اس کی حیثیت ایک ویرانے اور کھنڈر سے زیادہ نہیں۔ دل کا خلوص ہی دراصل اس کی زندگی ہے اور دل کی زندگی انسان کی زندگی ہے۔ دل کا خلوص سے خالی ہونا اس کی موت ہے اور دل کی موت انسان کی موت ہے۔ ؎

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

انسان کے لطیف ترین و دلکش نیم جذبات۔ عبودیت و بندگی، تقویٰ و خدا ترسی،

انابت وخشیت، اطاعت وفرماں برداری اور صبر وشکر دل ہی سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ یہی جذبات اعمال انسانی کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور خدا کے یہاں مال و اولاد کی نہیں، انہی حسین جذبات کی قدر ہوتی ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا:

یوم لا ینفع مال ولا بنون، الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔ (الشعراء ۸۸۔۸۹)

اس روز نجات کے لئے آدمی کا مال کام نہ آئے گا نہ اس کی اولاد کام آئے گی۔ ہاں اس کی نجات ہوگی جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے گا۔

اخلاص کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی انسان کو نجات نہ دلا سکے گا بلکہ الٹا اس کے لیے دخول جہنم کا سبب بن جائے گا۔ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”سب سے پہلا شخص جس کے خلاف قیامت کے دن دوزخ میں ڈالے جانے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی عدالت سے کیا جائے گا، ایک ایسا شخص ہوگا جو جہاد میں شہید کیا گیا ہوگا۔ یہ شخص خدائے تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا پھر خدائے تعالیٰ اس کو بتلائے گا کہ میں نے تجھے کیا کیا نعمتیں دی تھیں۔ وہ ان ساری نعمتوں کا اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا اور ان کو کن مقاصد میں استعمال کیا؟ وہ کہے گا کہ خداوند عالم! میں نے تیری راہ میں جہاد کیا، یہاں تک کہ شہید کر دیا گیا اور اپنی سب سے قیمتی متاع جان عزیز تیری راہ میں قربان کر دی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے۔ تو نے تو جہاد میں اس نیت سے حصہ لیا تھا کہ تیری جرأت و شجاعت اور دلیری وجوانمردی کا شہرہ ہو۔ تو تیرا یہ مقصد حاصل ہو گیا اور دنیا میں تیری بہادری کے خوب چرچے ہوئے۔ پھر اس کے لئے حکم خداوندی ہوگا اور وہ منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص ہوگا جس نے علم دین حاصل کیا ہوگا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی ہوگی اور خوب قرآن پڑھا ہوگا، اس کو بھی خدائے تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتوں کی یاد دہانی کرائے گا، وہ ان نعمتوں کا اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا، بتا تو نے ان نعمتوں سے کیا کام لیا، اور ان کو کن مقاصد کے حصول میں استعمال کیا؟ وہ کہے گا۔ پروردگار عالم! میں نے دین کا علم حاصل کیا اور اسے دوسروں کو سکھایا، تیری رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے قرآن پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے یہ بات غلط کہی تو نے دین کا علم اور

قرآن کی تعلیم اس لئے حاصل کی تھی کہ تجھے عالم اور قاری کہا جائے۔ چنانچہ دنیا میں تجھے خوب خوب عالم اور قاری کہا گیا اور تیرے علم و قرأت کی خوب شہرت ہوئی۔ پھر اس کے لئے حکم ہوگا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا شخص تھا جس کو خدائے تعالیٰ نے دولت کی فراوانی اور کشادگی و فراخی سے نوازا ہوگا اور ہر طرح کا مال دیا ہوگا۔ وہ بھی خدا کے حضور پیش ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں یاد دلائے گا وہ ساری نعمتوں کا اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے دریافت کرے گا کہ تو نے میری عطا کردہ ان نعمتوں سے کیا کام لیا اور ان کو کن مقاصد کے لئے استعمال کیا؟ وہ کہے گا: آقا! جس جس راستے اور جن جن کاموں میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے، میں نے تیرا دیا ہوا مال ان سب ہی میں خرچ کیا، اور میں نے یہ کام صرف تیری رضا کی طلب میں کیا۔ اللہ تعالیٰ کہے گا تو جھوٹ بولتا ہے۔ درحقیقت تو نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ دنیا میں تیری سخاوت و فیاضی کے چرچے ہوں اور تیری دریا دلی اور بخشش و عطا کی شہرت دور دور تک پہنچ جائے۔ سو تیرا یہ مقصد پورا ہو گیا۔ دنیا میں تیری داد و دہش کا خوب خوب شہرہ ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عدالت سے اس کے لئے بھی فیصلہ صادر ہوگا اور وہ بھی گھسیٹ کر منہ کے بل دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔“

(مسلم، عن ابی ہریرہؓ)

یہ حدیث ہر صاحب ایمان اور باشعور و مخلص مسلمان کو لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہؓ اس کو بیان کرتے وقت کبھی کبھی بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ حدیث حضرت معاویہؓ کے سامنے بیان کی گئی تو وہ بہت روئے اور روتے روتے بے حال ہو گئے۔ اس حدیث میں جن تین اعلیٰ درجے کے اعمال کا ذکر ہے اگر واقعی وہ خلوص دل کے ساتھ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور خالصۃً لوجہ اللہ کئے گئے ہوں تو بلاشبہ ان کا صلہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی اور جنت کے اعلیٰ درجات ہیں لیکن یہی اعمال جب طلب شہرت، جذبۂ ریاکاری اور دوسرے حقیر دنیاوی مقاصد کے حصول کی غرض سے کئے جائیں تو خدائے تعالیٰ کے یہاں ان کا کوئی اجر نہیں بلکہ الٹا ذلت و رسوائی کے ساتھ دخول نار کا سبب بن جائیں گے اور خالص دنیاوی کام جن کو آدمی اپنی ضرورت یا ذمہ داری کے طور پر انجام دیتا ہے، اگر ان میں نیت کا خلوص اور اس کی پاکیزگی شامل ہو جائے تو وہ کام بھی اس کے لئے باعث اجر و ثواب بن جائیں گے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جو شخص اپنے بستر پر، یہ ارادہ کر کے لیٹا کہ وہ تہجد کے لئے اٹھے گا لیکن اس کی نیند گہری ہو گئی اور وہ اٹھ نہ سکا۔ یہاں تک کہ فجر ہو گئی۔ تو ایسے شخص کے نامۂ اعمال میں اس رات کی نماز تہجد لکھی جائے گی اور یہ نیند اس کے لئے اس کے رب کی طرف سے بطور انعام شمار ہو گی۔" (زادراہ)

اخلاص سے خالی عظیم ترین اعمال ضائع و برباد ہو جاتے ہیں لیکن خلوص کے ساتھ کیا ہوا تھوڑا عمل بھی آدمی کی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا جس وقت آپؐ مجھے یمن بھیج رہے تھے، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔ تو آپؐ نے فرمایا "اپنی نیت کو خالص رکھو، جو بھی عمل کرو خدا کے لئے کرو تو تھوڑا سا عمل بھی تمہاری نجات کے لئے کافی ہے۔"

(زادراہ)

یہی نہیں بلکہ اگر آدمی خلوص نیت کے ساتھ کوئی کام کرنا چاہتا ہو مگر اپنی مجبوریوں کے سبب اسے اس میں شریک ہونے کا موقع نہ مل سکے تو بھی وہ اس کے ثواب سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ تبوک کی مہم سے فارغ ہو کر ہم لوگ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ واپس ہوئے تو آپ نے راستے میں فرمایا کہ "کچھ لوگ مدینے میں ہمارے پیچھے مقیم رہ گئے لیکن فی الواقع وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ ہم لوگ جس گھاٹی میں بھی گئے اور جو وادی بھی ہم نے طے کی ہر جگہ وہ ہمارے ساتھ رہے لیکن عذر نے ان کو روک دیا۔" (بخاری)

خدائے تعالیٰ سے اجر و ثواب کی طلب کے علاوہ کسی دنیاوی غرض یا شہرت و ناموری کی خواہش میں کوئی کام کرنا ریا ہے اور ریا کی ادنیٰ مقدار بھی شرک ہے اور سب سے رذیل ترین اخلاقی برائی ہے۔ ایک دن حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں پہنچے تو وہاں دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کے پاس بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ انھوں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ "تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو آدمی لوگوں کے سامنے تو اچھے طریقے سے خوب خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتا ہے مگر جب تنہائی میں پڑھتا ہے تو ٹھیک سے نہیں پڑھتا، یہ شخص اپنے رب کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کی توہین کرتا ہے۔"

قرآن پاک میں صدقہ و خیرات کرنے والے دو قسم کے آدمیوں کے انجام کو ایک مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ ایک قسم کے لوگ وہ ہیں جنھوں نے ریاکاری اور طلب شہرت کی نیت سے اپنے مال خیر کے کاموں میں خرچ کئے، دوسرے وہ جو محض اللہ کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کی طلب میں دوسروں اور فقراء و مساکین کی مدد کرتے ہیں۔ دونوں کے کام قطعی طور پر یکساں ہیں۔ ظاہر بین نگاہوں کو دونوں کے عمل میں بظاہر کوئی فرق نہیں نظر آتا لیکن خدائے علیم و خبیر اور رب علیم بذات الصدور میں خبر رکھتا ہے کہ چونکہ دونوں کی نیتوں میں فرق تھا اس لئے دونوں کے نتیجے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ ایک کا عمل خدا کی بارگاہ میں شرف قبولیت حاصل کرے گا اور دوسرے کا عمل ضائع و برباد ہو جائے گا۔

"اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر، اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کی بارش ہوئی تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لئے دل کے پورے قرار و ثبات کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہو جائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو، نہروں سے سیراب، کھجوروں، انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اس وقت ایک تیز بگولے کی زد میں آکر جھلس جائے جب کہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کمسن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں۔ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے، شاید کہ تم غور و فکر کرو۔" (تفہیم القرآن۔ بقرہ ۲۶۴ تا ۲۶۶)

ریاکار کی ریاکاری خود اس بات کی دلیل ہے کہ نہ تو وہ خدا پر یقین رکھتا ہے جس سے اجر پانے کی امید رکھے، نہ آخرت پر اس کا ایمان ہے جہاں وہ اپنے عمل کا ثواب حاصل کرنے کی امید رکھتا ہو۔ محض لوگوں کو دکھانے کے لئے اس کا عمل کرنا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ خلق ہی اس کا خدا ہے۔

جس سے وہ اجر و ثواب کا خواہش مند ہے۔ اللہ سے اس کو نہ اجر کی توقع ہے نہ اسے اس بات کا یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیا جائے گا۔ اسی وجہ سے اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے ریاکاروں کو سخت ترین عذاب کی وعید سنائی ہے۔

عن ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم قال ان في جهنم لواديا يستعيذ جهنم من ذالك الوادي في كل يوم اربع مائة مرة، اعد ذالك الوادي للمرائين من امة محمد صلى الله عليه وسلم لحامل كتاب الله والمتصدق في غير ذات الله والحاج الى بيت الله والخارج في سبيل الله۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جہنم میں ایک ایسی وادی ہے جس سے جہنم بھی ہر روز چار سو مرتبہ پناہ مانگتا ہے۔ یہ وادی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کے ریاکاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ کتاب اللہ کے عالم کے لئے، صدقہ و خیرات کرنے والے کے لئے، بیت اللہ کا حج کرنے والے کے لئے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لئے۔

تمام انسانوں کو خداوند عالم کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ عبودیت و بندگی کے سارے مراسم صرف اسی کے لئے ادا کریں اور ان میں شرک و ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ پیدا ہونے دیں۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ۔ (البینۃ ۵)

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لئے خالص رکھ کر یکسو ہو کر۔

خدا کے یہاں اجر و ثواب کا حق دار قرار پانے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا ہر کام خالصتاً لوجہ اللہ ریا اور شہرت کی خواہش سے پاک ہو۔ ہمارے ظاہر کی طرح ہمارے باطن کا قبلہ بھی بالکل درست ہو اور ہم ایک مسلم حنیف کی طرح دل کی گہرائیوں سے اس بات کا اعلان کریں کہ:

اني وجهت وجهي للذي فطر السموات والارض حنيفا وما انا من المشركين، ان صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين

میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب

لا شريك له۔ (انعام ۱۶۲، ۱۶۳)

اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

لیکن یہ اعلان جتنا آسان ہے زندگی بھر اسی پر کاربند رہنا اور اپنے دل کو ریا کے ہر شائبہ سے پاک رکھنا اتنا سہل نہیں ہے۔ ریا ایک ایسا جذبہ ہے جو نہایت خاموشی کے ساتھ بالکل دبے پاؤں آدمی کے دل میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ دھوکے میں پڑ جاتا ہے اور اس کا پورا خرمن عمل جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے دل کی پوری چوکسی اور پاسبانی کرنی پڑے گی۔ ــــ

ہوا ہی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
بہت چھپ چھپ کے سینوں میں بنا کرتی ہیں تصویریں

جنتی کی پہچان

جناب مولانا جلیل احسن ندوی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى، قِيلَ وَمَنْ أَبَى؟ قَالَ مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى۔ (بخاری)

ترجمہ: ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے سوائے ان لوگوں کے جو انکار کریں گے۔ پوچھا گیا کہ انکار کرنے والوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ آپؐ نے فرمایا جو میری اطاعت کریں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور جو میری نافرمانی کریں گے وہ انکار کرنے والے ہیں۔

تشریح: یہ حدیث واضح طور پہ بتاتی ہے کہ جو لوگ نبیؐ کے بتائے ہوئے راستے پہ چلیں گے وہی جنت کے حقدار ہوں گے۔ ایسے نافرمان امتی جنھوں نے نبیؐ کی راہ نہیں اپنائی وہ جنت سے نامعلوم مدت تک محروم رہیں گے۔ نبیؐ کے حکم پر نہ چلنا انکار کے ہم معنی ہے۔

مرسلہ: مہدی ایم۔ اے

جناب مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب استاذ جامعہ فلاح

شبینہ

سوال:-

(۱) ہمارے یہاں بنارس میں شبینہ متعدد حفاظ مل کر ایک ہی رات میں پورے قرآن پاک کو لاؤڈ اسپیکر میں پڑھتے ہیں۔ جبکہ اہل محلہ محو خواب ہوتے ہیں۔ قریب قریب کی متعدد مساجد میں ایک ہی رات میں اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس سے آواز بھی ٹکراتی ہے استماع میں بھی خلل پڑتا ہے۔ خاص طور سے رمضان میں ہی اس کا التزام کیا جاتا ہے۔ جبکہ حافظ قرآن پڑھنے میں مشغول رہتا ہے، کچھ لوگ کھانا پکانے میں، کچھ لوگ چائے بنانے اور پینے میں مصروف رہتے ہیں اور کچھ لوگ بیڑی اور سگریٹ کا مشغلہ رکھتے ہیں، اور کچھ لوگ مختلف قسم کی دنیوی گفتگو میں مصروف رہتے ہیں غرضیکہ چند لوگ ہی بیٹھ کر باقاعدہ سنتے ہیں۔ اس موقع پر چندہ کرکے کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا ہے اور جو لوگ چندہ دینے سے انکار کرتے ہیں ان کو مطعون کیا جاتا ہے۔ کیا اس طرح شبینہ کا انتظام درست ہے؟

(۲) اگر کوئی شخص چندہ کی اہمیت کے سلسلہ میں اس جملے کو کہے کہ "مسجد بھی بغیر چندہ کے نہیں چلی ہے" تو اس کے قائل کا شرعی حکم کیا ہوگا؟

(۳) منہ میں پان لے کر سجدۂ تلاوت ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب مفصل و مدلل ہونا چاہئے تاکہ عوام کی اصلاح ہو۔

جواب:-

آپ نے اپنے سوال کے اندر جو شبینہ کے مختلف منکرات واوصاف لکھے ہیں ان کے ہوتے ہوئے اس شبینے کو مفاسد و منہیات کا ایک مجموعہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ شبینہ تو ہمارے ضلع میں بھی بعض مقامات پر رمضان میں ہوتا رہتا ہے۔ منع کرنے کے باوجود ضدی و جاہل لوگ اس سے باز نہیں رہتے۔ اس میں بھی وہ منکرات قبیحہ و مفاسد شنیعہ جو آپ نے ذکر کئے ہیں کم و بیش

تمام ہی پائے جاتے ہیں۔ اس شبینہ میں پورے قرآن مجید کو متعدد حفاظ یکے بعد دیگرے پڑھ کر ختم کرتے ہیں چونکہ تراویح کے اندر ایک رات میں پورے قرآن کو ختم کرنا کوئی آسان بات تو ہے نہیں، اس میں کافی وقت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے بعجلت تمام جلدی جلدی پڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ رات بھر میں کسی طرح ختم ہو جائے جس کا اولین نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ ترتیل قرآن جو فرض ہے اس کا التزام و اہتمام بالکل نہیں ہو پاتا جو اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حکم ورتل القرآن ترتیلا کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہ پہلی ہی وجہ اس شبینہ کے عدم جواز کے لئے کافی ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہات فاسدہ ہیں جو میں آگے تحریر کرتا ہوں۔ دیکھئے چونکہ صبح صادق سے پہلے ہی تک تراویح کا وقت رہتا ہے اس لئے شبینہ کرنے والے جہاں تک ہو سکتا ہے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وقت کے اندر صبح صادق سے پہلے ہی قرآن ختم ہو جائے۔ اس سلسلے میں نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کے یہاں کیا معمول ہے۔ ہمارے یہاں تو نماز مغرب کے فوراً بعد بلا تاخیر کوئی حافظ نماز با جماعت کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ تراویح کا وقت بالاتفاق عشاء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا نماز عشاء سے پہلے پڑھی ہوئی نماز نماز تراویح نہیں ہو سکتی اس لئے اس کو تراویح سمجھنا بے اصل بات ہے اور دوسری اصل بات یہ ہے کہ جب عشاء سے قبل پڑھی ہوئی با جماعت نماز نفل نماز تراویح نہیں ہے تو اس میں یہ جو التزام جماعت و تداعی ہوتی ہے بدعت مکروہ تحریمی ہے۔ بتائیے کیا اس دوسری وجہ سے بھی اس کا عدم جواز آشکارا نہیں ہے؟

اور آگے یہ بھی دیکھئے کہ تراویح باتفاق جمہور کم از کم بیس رکعت ہے۔ اگر یہ کوئی قلیل العلم کو تراویح سمجھ کر صرف آٹھ ہی رکعت کا قائل ہو گیا ہو تو اس کا ذکر ہی کیا۔ شبینہ مذکورہ میں تو بیس رکعات کوئی نہیں پڑھ پاتا نہ مقتدی نہ امام۔ اگر کوئی بڑی ہمت و محنت کرکے پوری رات پڑھتا رہے اور اپنی بیس رکعات پوری کر لے تو یہ شاذ کالمعدوم ہے علی العموم دیکھا جاتا ہے کہ دو رکعت پوری پڑھ لینے والا تیسری اور چوتھی رکعت پڑھنے کی ہمت نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں کیا یہ بیس رکعات سنت مؤکدہ کے بجائے دو یا چار رکعت ہی پڑھنے سے سنت مؤکدہ ادا ہو جاتی ہے؟ اگر نہیں تو ایسا شبینہ کیسے صحیح و درست ہو سکتا ہے جس میں علی العموم نہ مقتدی پوری تراویح

پڑھتے ہوں نہ امام نہ حفاظ۔ یہ تراویح سنتِ مؤکدہ ہے تو اس طرح سنتِ مؤکدہ کو غارت کرنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

شبینے کے عدمِ جواز کی ایک وجہ یہ ملاحظہ کیجئے۔ چونکہ اس میں بیس ہی رکعت کے اندر صبح صادق سے قبل ہی قرآن ختم کر لینا لازم ہوتا ہے اس لئے ہر ایک رکعت طویل سے طویل تر ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ اس انتظار میں آرام سے بیٹھے رہتے ہیں کہ جب امام رکوع کرے گا تو جلدی سے اٹھ کر نماز میں شامل ہو جائیں گے کہ کسی رکعت کا رکوع پا لینے سے وہ رکعت مل جاتی ہے اور اس رکعت کو سلام کے بعد پورا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس طرح سے ایک رکعت بغیر تکلیف اٹھا کر دو رکعت کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا یہ کسلمندی کا واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ کے مثل نہیں ہے۔ کیا کسلمندی کے ساتھ نماز کے لئے اٹھنا منافق ہونے کی علامت نہیں ہے؟ کیا یہ چیز شبینے کے مکروہ و ناجائز ہونے کی وجہ نہیں ہے؟ اور جس مسجد میں یہ شبینہ ہوتا ہے اس کے اکثر مصلی خود تو روشنی، فرش، سامان خورد و نوش وغیرہ کے انتظام میں مشغول رہتے ہیں اور دیگر مساجد سے آکر شرکت کرنے والے مصلیوں کو تراویح پڑھنے پر بٹھا دیتے ہیں اور خود کو عدیم الفرصت سمجھ کر الگ رکھتے ہیں نیز شبینے میں طول قرأت کی وجہ سے مقتدیوں پر سماعِ قرآن گراں اور نماز اتنی ثقیل ہو جاتی ہے کہ بعض مقتدی کبھی قیام چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کبھی بیٹھے بیٹھے گھبرا کر کھڑے ہو جاتے ہیں یہ قیام سے قعود اور قعود سے قیام کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اس طرح سخت پریشانی و بیقراری کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ اگر بس چلے تو نماز ہی توڑ کر الگ ہو جائیں۔ ایسی باتیں اس مروجہ شبینے میں تقریباً ضرور ہوتی ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جس شبینے میں اس طرح کے مفاسد عام طور پر پائے جاتے ہوں کیا اس کو جائز ہونا چاہئے۔ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اس کے ناجائز ہونے کی ایک وجہ اور سنئے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے: واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا الخ۔ اس آیت میں قرآن پڑھے جانے کے وقت کان لگا کر سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن مروجہ شبینے میں بجائے اس کے کہ لوگ

کان لگا کر قرآن سنیں اور خاموشی اختیار کریں، ہوتا یہ ہے کہ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ یا تو باتیں کرتے رہتے ہیں یا چائے نوشی اور دیگر مشاغل میں لگے رہتے ہیں۔ حق تو یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ تراویح پڑھنے میں شامل رہیں مگر افسوس کہ اس وقت منافی نماز حرکتیں ان پر غالب و مستولی ہوتی ہیں۔ اب لاؤڈ اسپیکر کا عام رواج ہو جانے کی وجہ سے لوگ آس پاس کہیں بھی ہوں سے قرأت قرآن کی آواز کانوں میں پہنچتے رہنے کی وجہ سے اس کو توجہ سے سننا اور خاموش رہنا فرض ہوتا ہے لیکن کسی کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اپنی اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں گویا شبینے میں تراویح کی حیثیت عبادت کی نہیں بلکہ ایک جشن اور میلے کی ہو جاتی ہے اور اکثر و بیشتر لوگ ترک استماع و انصات کے مرتکب رہتے ہیں حالانکہ استماع و انصات فرض ہیں۔ ذرا سوچئے جس شبینے سے ایسی ناروا حالت پیدا ہو جاتی ہو وہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ یہ حالت تو ان لوگوں کی ہے جو یہاں شبینے میں شرکت کے لئے موجود ہوتے ہیں لیکن لاؤڈ اسپیکر پر شبینہ پڑھنے سے ایک دوسری قباحت یہ بھی ہے کہ اس سے پورے محلے یا شہر کے لوگوں کی نیند داں میں خلل پڑتا ہے۔ ان میں معذور و مریض لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں بعضوں کو سکوت و سکون کی انتہائی ضرورت ہوتی ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جب تک ان کو پورا ماحول سکون حاصل نہ ہو وہ نیند سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔ مقامی غیر مسلم آبادی بھی ہوتی ہے۔ یہ شرعی احکام کی مکلف نہیں ہے۔ آخر ان شبینے والوں کو کس نے یہ اختیار دیا ہے کہ ان تمام لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوں اور انہیں خوابِ استراحت سے بہرہ مند ہونے میں مخل ہوں۔ یہ قرآن مجید جو انسانوں کو دنیا و آخرت میں آرام و راحت سے ہمکنار کرنے کے لئے آیا ہے اگر اسی کو لوگوں کی تکلیف و پریشانی کا سبب بنایا جائے تو کیسی الٹی بات ہے۔ کیا ایسا کرنا درست ہو سکتا ہے؟ مسجد سے باہر جہاں تک آبادی میں اس لاؤڈ اسپیکر کی آواز پہنچتی ہے بہت سے مسلمان مرد بھی اور مسلم خواتین اپنے اپنے مشاغل و ضروریات میں منہمک ہوں تو کیا بے موقع و بے محل بھی ان کو جبراً استماع قرآن و انصات کا پابند بنانا درست ہے؟ اور ایسے مشغول و غیر متوجہ لوگوں کو خواہ مخواہ سجدہ تلاوت والی آیتیں سنانا، خصوصاً جب کہ وہ سجدہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ ہوں کیا صحیح ہے؟ اور جو مسلمان عورتیں بھی تو گھروں میں نماز عشاء و تراویح پڑھتی ہیں کیا لاؤڈ اسپیکر پر

قرآن خوانی کی وجہ سے ان کا پڑھنا دشوار نہیں ہو جاتا ہوگا، لاؤڈ اسپیکر کی اس اونچی آواز سے کیا ان کی قرأت متاثر نہیں ہوتی ہوگی۔ اس صورت میں کیا وہ بار بار نماز میں بھول نہیں جاتی ہوں گی، کیا کسی کی عبادت میں اس طرح کی مشکلات پیدا کرنا خواہ قرآن کی تلاوت ہی سے ہو، شرعاً درست ہے؟ آخر یہ موٹی موٹی باتیں لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتیں؟

آپ نے سوال میں یہ بھی لکھا ہے کہ قریب قریب کی مساجد میں ایک ہی رات کے اندر اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس سے باہم آواز بھی ٹکراتی ہے۔ یہ بھی عدم جواز کی ایک وجہ ہے، کیونکہ قرآن مجید جب پڑھا جاتا ہے تو جیسے اس کو خاموشی کے ساتھ سننا فرض ہے بالکل اسی طرح دوسرے قرآن پڑھنے والے لوگ بھی اس کے پابند ہیں کہ قرآن کو سنیں اور خاموشی اختیار کریں کیونکہ ان تک بھی قرأت قرآن کی آواز پہنچتی ہوتی ہے۔ اگر تمام مسجدوں کے لوگ اپنا اپنا یہ سلسلہ پڑھتے ہی چلے جائیں تو سب کی جانب سے ترک استماع و ترک انصات لازم آئے گا۔ لہٰذا یہ بھی درست نہیں۔

مسجد کے اندر سگریٹ، بیڑی کے پینے کا جواز تو درکنار، انھیں مسجد سے باہر پینے کے بعد بھی جب تک منہ سے بدبو آتی رہے مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے بلکہ کوئی بھی ایسی چیز استعمال کر کے مسجد میں داخل ہونا درست نہیں ہے جس کی بدبو دخول مسجد تک باقی رہے، جس چیز کی بدبو سے انسان کو تکلیف محسوس ہوتی ہے اس سے ملائکۃ الرحمٰن بھی متاذی ہوتے ہیں۔ کما فی الحدیث..... فان الملٰئکۃ تتاذی مما یتاذی منہ الانس۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ۔ ص۶۹)

شبینہ میں مسجد کے اندر لوگ جو دنیا کی باتیں کرتے ہیں یہ قطعاً جائز نہیں ہے۔ مسجد کے اندر دنیا کی بات کرنے سے چالیس روز کے مقبول اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔

آپ نے اوپر جو یہ معروضات ملاحظہ فرمایا یہ مروجہ شبینہ کی صحیح تصویر ہے۔ پس جو چیز اتنے مفاسد و شناعت کا مجموعہ ہو ہرگز جائز و درست نہیں ہو سکتی۔ اسے نیکی و عبادت سمجھنا اور باعث اجر و ثواب جاننا کھلی ہوئی خود فریبی ہے۔

آپ نے اپنے سوال میں یہ بھی لکھا ہے کہ خرچ برچ اور کھانے پینے کے انتظام کے لئے چندہ بھی کیا جاتا ہے اور جو لوگ چندہ دینے سے انکار کرتے ہیں ان کو مطعون بھی کیا جاتا ہے

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ مسلمانوں کا مال بغیر ان کی رضا و طیب خاطر کے جبراً لینا ناجائز ہے۔ خواہ وہ جبر سلب و نہب کی صورت میں ہو یا طعن و تشنیع اور شخصیات کے دباؤ کے ذریعہ ہو۔ ایسے چندے کا لینا جائز ہے نہ اس کا استعمال کرنا۔

اب آخیر میں ایک بات اور سن لیجئے کہ شبینہ اگر تراویح کے بعد کیا جائے تو اس میں بھی یہ خرابی ہوگی کہ مطلق نفل کی جماعت مجمع کثیر کے ساتھ مکروہ ہے جیسا کہ اوپر بھی میں نے عرض کیا ہے۔ اور تراویح کے ساتھ ہو تو اس کی خرابیاں اور خامیاں مفصلاً مذکور ہو چکی ہیں لیکن اتنا تو اور سن لیں کہ امام کو جو تخفیف صلوٰۃ کا حکم ہے، یہاں طول قرأت کی وجہ سے اس کی بھی مخالفت لازم آتی ہے اور یہ بھی کہ قرآن کو ختم کرنے کے پھیر میں اس قدر جلدی جلدی پڑھتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ اس طرح سے اکثر استماع قرآن کا ضیاع اور ترتیل و تجوید کا فقدان عام بات ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حروف کے مخارج و صفات کیا ادا ہوں گے اور شبینے میں اکثر فخر و نمود کا بھی قصد ہوتا ہے، یہ چیز اخلاص نیت کے منافی ہے۔ اور کہیں کہیں عوض مالی کی بھی امید ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں اس کے عدم جواز کے وجوہات ہیں۔ یہاں ایک فقہی قاعدہ بھی جان لیں کہ ہر وہ امر جائز و مندوب جس میں شریعت مطہرہ نے اہتمام کا حکم نہ دیا ہو، اگر ان میں مفاسد کا غلبہ ہو تو اس کو ترک کر دینا مناسب بلکہ بعض احوال میں واجب ہوتا ہے۔

لہٰذا اب آخیر میں ایک بات یہ بھی واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مروجہ شبینہ میں دیوبندی و بریلوی کا بھی اختلاف نہیں ہے۔ بہار شریعت جو بریلوی لوگوں کے نزدیک فقہ کی ایک معتبر اور بڑی کتاب ہے اس کے ص۳۶ ح۴ میں لکھا ہے کہ شبینہ کہ ایک رات کی تراویح میں پورا قرآن پڑھا جاتا ہے جس طرح آج کل رواج ہے کہ کوئی بیٹھا باتیں کر رہا ہے، کچھ لوگ لیٹے ہیں، کچھ لوگ چائے پینے میں مشغول ہیں، کچھ لوگ مسجد کے باہر حقہ نوشی کر رہے ہیں اور جب جی میں آیا ایک آدھ رکعت میں شامل بھی ہو گئے، یہ ناجائز ہے۔

(۲) یہ بات بڑی بے باکانہ اور کھلی ہوئی سخت جسارت و بے خوفی کی علامت ہے۔ اس سے توبہ کرنا چاہیے۔

(۳) جائز تو ہے مگر مناسب نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ●●

اسلامی فقہ اور اس کے جدید تقاضے

جناب مولانا اقتدار احسن صاحب، استاذ جامعۃ الفلاح

فقہ کی روح

مذکورہ بالا تصریحات سے فقہ کی اصل روح اور اس کے سرچشمۂ حیات کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے فقہ کی زندگی اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کا اس کی ہر ترقی یافتہ شکل میں ساتھ دے سکے اور ہر موقع و مرحلہ میں معاملاتِ زندگی کی ایسی تنظیم کرے جو عدل کے تقاضوں کا بہترین مظہر ہو، کسی منزل اور موڑ پر وہ اس کی رہنمائی سے عاجز و بے بس نہ ہو لیکن معاملات کی کوئی ایک ہی متعین شکل نہیں ہوتی بلکہ ان میں مسلسل تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے اس لئے کسی خاص عہد کی فقہی اصطلاحات اور ان کے معنوی دائروں کی متعین حدود و وسعت کو ہر دور میں برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ حالات معاملات جتنی کروٹیں بدلتے جاتے ہیں ان کے اشاروں اور تقاضوں کی حدود و وسعت میں تبدیلی کے مطابق اصطلاحات کے معنوی دائروں کے حدود بھی بدلتے جانے چاہئیں کیونکہ معاملات کے بعض گوشوں کی تبدیلی کے نتیجہ میں بعض گوشے ابھر آتے ہیں اور ان سے متعلق بعض دوسرے گوشے قدرتی طور پر دب جاتے ہیں۔ اس صورت میں اصطلاحوں کے وہ معنوی دائرے جو کسی خاص دور میں متعین کئے گئے تھے بعینہٖ قائم رکھے جائیں تو ظاہر ہے عدل کا پورا ظہور نہیں ہوگا بلکہ بسا اوقات سرے سے اس کا وجود ہی کالعدم ہو جائے گا اور عدل کا وجود ختم ہو جانے کے بعد فقہ کو اسلامی فقہ بہرحال نہیں کہا جا سکتا مگر چونکہ اجتہاد کے ذریعہ ہی فقہ عدل کے ان تقاضوں کو پورا کرتی ہے، اس لئے اجتہاد کو فقہ کا وہ سرچشمۂ حیات یا اس کی وہ روح قرار دیا جا سکتا ہے جس کے بغیر وہ عدل کے تقاضوں سے منحرف ہو کر زندگی کا ساتھ دینے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے زندگی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور خود بھی مردہ ہو جاتی ہے کیونکہ عدل کے تقاضوں سے انحراف کی صورت میں بے چینی اور دشواری پیدا ہو جاتی ہے اس لئے زندگی اس کو نظرانداز کر کے آگے نکل جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

فقہ کی اس حقیقت کی روشنی میں اس کے موجودہ تقاضوں کو جاننے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس کی تاریخ ارتقا پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے تاکہ ارتقا کا تسلسل ڈھونڈھ پائے اور ماضی سے ربط برقرار رکھتے ہوئے آگے کی طرف بڑھا جا سکے۔

فقہ صحابہ

چونکہ اجتہاد فقہ کی روح اور اس کا سرچشمۂ حیات ہے اس لئے عہد نبوی سے لے کر متحرک فقہ اسلامی کے ہر دور میں اجتہاد کی مسلسل اور لگاتار کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

نبی کی حیات تک اگرچہ تمام معاملات میں آپ ہی پر اعتماد کیا جاتا تھا لیکن سفر وغیرہ کے موقعوں پر آپ سے دوری کے وقت مختلف معاملات میں صحابہ کرام اپنی رائے سے کام لیتے تھے۔ بعد میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی تائید یا تردید سے اگرچہ اس کی حیثیت سنت کی ہو جاتی تھی لیکن نبی کی زیرنگرانی تربیتِ اجتہاد کی ضرورت پوری ہوتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی وفات کے بعد ضرورت کے ہر موقع پر صحابہ نے اجتہاد کو ایک دینی ضرورت سمجھا کیونکہ اجتہاد نہ صرف یہ کہ فقہ اسلامی کو زندہ، متحرک رکھنے اور ترقی یافتہ زندگی سے ہم آہنگ و ہم رکاب بنانے کے سلسلہ میں اس کے قلب و روح کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ دین کی بقا و تحفظ کا بھی وہی تنہا ضامن تھا اس لئے بلا استثنا صحابہ میں جن لوگوں نے اپنے اندر بحث و نظر کی صلاحیت محسوس کی، انھوں نے بوقت ضرورت اجتہاد سے فتاوے دیئے۔ اگرچہ منصبی حیثیت سے اس کی ذمہ داری قدرتی طور پر کبار صحابہ کے سر آئی کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ملت کی دینی رہنمائی کے اصل ذمہ دار وہی تھے۔

حافظ ابن قیمؒ نے صاحب فتاویٰ فقیہ صحابہ کو تین طبقوں میں تقسیم کر کے بتایا ہے کہ حضرات عمر، علی، عبداللہ ابن مسعود، عائشہ، زید بن ثابت، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین ان صحابہ میں سے تھے جن کے فتاوے کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے علاوہ حضرات ابوبکر، ابوہریرہ، عثمان، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اجمعین کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جن کے فتاوے نہ بہت زیادہ ہیں نہ بہت کم۔ ان حضرات کے علاوہ صحابہ کی ایک کثیر تعداد ایسی تھی جو صاحب فتویٰ و اجتہاد تھی لیکن ان کے اجتہاد و فتویٰ کی تعداد بہت کم ہے حتی کہ بعض سے صرف ایک یا دو فتاوے منقول ہیں۔

شہر میں بھی چونکہ مختلف ذوق و فکر و نظر کے لوگ تھے اس لئے ان کے طریقہ ہائے استدلال بھی باہم مختلف تھے۔ حضرت عمرؓ علت حکم کی معرفت کو اپنے اپنے اجتہاد و فتوے کی بنیاد بنایا کرتے تھے لیکن دوسروں کو علت حکم کی بنیاد پر اجتہاد کی تعلیم دیتے تھے اسی وجہ سے عبداللہ بن مسعودؓ علت کی بنیاد پر فتویٰ صادر فرمایا کرتے تھے اور ان کی تعلیم کی وجہ سے فقہاء عراق نے بھی علت کو ہی بنیاد اجتہاد بنایا۔

لیکن اکثر مسائل میں صحابہ کے اجتہاد کی نوعیت اجتماعی تھی۔ جو مسئلہ درپیش ہوتا اس پر تمام فقہاء صحابہ باہم غور و فکر اور بحث و تمحیص کرتے اور بحث و نظر کی طویل جد و جہد کے بعد کسی مسئلہ کا کوئی حکم متعین کرتے۔ اس طویل بحث و تمحیص کے بعد اگر تمام فقہاء صحابہ کسی رائے پر اتفاق کر لیتے تو اس رائے یا اجتہاد کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی جس کو اجماع سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایک مستقل ماخذ شریعت سمجھا جاتا ہے حالانکہ وہ بھی رائے کی ایک قسم ہے۔

فقہ تابعین

مختلف صحابہ کے زیر تربیت تابعین کا گروہ تیار ہوا۔ چونکہ ہر صحابی کے اصول فتاویٰ اور طریقہ اجتہاد یکساں نہیں تھے اس لئے تابعین کے مختلف گروہ بھی مختلف صحابہ کے حلقہ تلمذ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے مختلف طریقہ ہائے اجتہاد و فتاویٰ کی راہ پر چل پڑے۔ ان میں سے جس کو جس علاقہ میں قیام کرنا پڑا اس کے شیخ و استاد صحابی کی فقہ اور طریقہ اجتہاد کو قبول عام حاصل ہو گیا۔ اس طرح فقہ کے مختلف مکاتب کی داغ بیل پڑنی شروع ہو گئی۔

فقہ ائمہ اربعہ

چنانچہ جب تابعین کے تلامذہ کا زمانہ آیا تو فقہ اسلامی کے اندر باقاعدہ مختلف مکاتب کا ظہور عمل میں آیا۔ اگرچہ اہل سنت کے چار ہی مذاہب فقہ میں مشہور ہیں لیکن اصلاً ان کی تعداد انیس تک پہنچتی ہے۔ مذہب ثوری، مذہب اوزاعی، مذہب لیث بن سعد، مذہب ظاہری، مذہب طبری وغیرہ مختلف مذہب تھے جو ختم ہو گئے۔ یہ مذاہب اربعہ کے علاوہ تھے۔ لیکن یہ مذاہب چونکہ باہم بہت زیادہ مختلف نہیں تھے، اس لئے ائمہ اربعہ کے مذاہب میں رفتہ رفتہ جذب ہو گئے۔ خود یہ مشہور مذاہب اربعہ بھی باہم بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ اگر ان چاروں پر تحقیقی نگاہ ڈالی جائے تو ان کو دو طبقوں میں سمیٹ لیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ اہل رائے کا اور دوسرا اہل حدیث کا۔

کیونکہ خلافت راشدہ کے بعد دینی مرکزیت ختم ہو جانے کی وجہ سے اجتہاد کے بارے میں بعض صحابہ نے محتاط روش اختیار کر لی۔ ان کی تا بمقدور کوشش یہ ہوتی کہ حدیث ہی پر عمل کیا جائے اس لئے اجتہاد کا رجحان ان کے ہاں کم رہا۔ ایسے صحابہ کرامؓ کے زیر تربیت جو گروہ تابعین اٹھا وہ بھی اسی روش احتیاط پر قائم رہا بلکہ تابعین و تبع تابعین کے زمانہ میں فتنوں کے ظہور کی وجہ سے محکم احادیث کے رجحان میں مزید شدت پیدا ہو گئی اور اجتہاد و رائے سے حتی الوسع اجتناب کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ضرورت کے تقاضے ان کے سامنے آئے تو حدیثوں کی تلاش و جستجو کا رجحان اور زیادہ ہوا اور جب بھی انھیں کوئی حدیث مل گئی، چھان بین اور رد و قدح کے بعد اس پر اعتماد کر لیا اور اس کے مطابق عملی رویہ اختیار کیا۔ اس طرح بہت سی ان احادیث کو بھی مستند بنا لیا گیا جو دوسرے ائمہ کے نزدیک اصول روایت کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں جس سے اجتہاد کی ضرورت بڑی حد تک کم ہو گئی۔ یہ صورت حال مدینہ کے فقہائے تابعین کے ساتھ بھی پیش آئی جن کے امام مالک بن انسؒ تھے۔ ان کے شاگرد امام شافعیؒ اور امام شافعیؒ کے شاگرد امام احمد بن حنبلؒ تھے۔ احتیاط کی یہی روش تھی جس کی وجہ سے ان تینوں فقیہوں میں مفروضات سے بحث کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ واقعی مسائل میں بھی اسی وقت اجتہاد کیا جاتا تھا جب کہ اس کا مبنی کوئی مستند روایت ہو اور امام احمد بن حنبل تو تمام تر روایت پر اعتماد کرتے تھے۔ اس طرح یہ تینوں مذاہب معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں اور یہ معمولی اختلاف بھی اختلاف ماحول کا نتیجہ ہے۔

مدینہ کے برخلاف عراق کے دینی معلم عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔ حضرت عمرؓ نے بہت کثرت سے اجتہاد کیا حتی کہ نہ صرف شرعی امور ہی میں بلکہ اقتصادی و عمرانی امور میں بھی انھوں نے کثرت سے اجتہاد کی بنیاد پر فتوے دیئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی اجتہاد سے فتویٰ دینے میں حضرت عمرؓ کے طریقہ پر تھے ان کے شاگرد خاص علقمہ تھے علقمہ سے ابراہیم نخعی نے اخذ کیا تھا۔ نخعی کے تلمیذ حماد تھے اور حماد ابو حنیفہ کے استاد و شیخ تھے۔ اس طرح فقہاء عراق میں اجتہاد و رائے سے بوقت ضرورت کام لینے کی روایت زیادہ رائج ہوئی اور وہ اصحاب رائے کہلائے۔ لیکن اصحاب رائے اور اہل حدیث کے یہ دونوں گروہ اجتہاد کی ضرورت و اہمیت اور بوقت ضرورت اس سے کام لینے کے معاملہ میں باہم متفق ہیں گو بغیر اس کے

فقہ اسلامی کو جمود و تعطل سے بچایا نہیں جا سکتا تھا۔ فرق جو کچھ ہے صرف اس بات میں ہے کہ ایک گروہ عمل بالحدیث میں قدرت و اجتہاد و رائے سے بقدر اجتناب و احتراز کی راہ پر چلتا ہے اور دوسرا اس کے برعکس حدیث کو قبول کرنے میں زیادہ چھان پھٹک اور تنقیح کرتا ہے اور اجتہاد و رائے سے فتویٰ دینے میں بہتری سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی کے اندر زیادہ وسعت اور زمانہ کا ساتھ دینے کی زیادہ صلاحیت نظر آتی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعد کے فقہائے احناف نے خیالی تفریعات اور قانونی موشگافیوں میں اس درجہ غلو سے کام لیا ہے کہ فقہ حنفی کی موجودہ اول کتابوں کے مطالعہ سے اس کے خلاف بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی غلو کا نتیجہ تھا کہ کتاب الحیل مرتب کر ڈالی گئی اور اس کو امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ حالانکہ امام صاحب حیلوں کو قطعی روا نہیں سمجھتے تھے کہ یہ غیر کو دھوکا دینے اور دین و ایمان کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ حقیقت ہے کہ حیلوں سے مقصد برآری کی بعض معاملاتی صورتوں کو امام صاحب نے جائز قرار دیا تھا جیسا کہ امام علامہ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین میں اس پر مفصل گفتگو کی ہے۔

فقہ کا لباسِ نو

مذاہب محدثہ کے ظہور کا یہ پس منظر سامنے رکھ کر اگر علمی و تحقیقی انداز سے غور کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ چاروں فقہوں کے درمیان اختلاف راہ کی مسافتیں سمٹ آتی ہیں بلکہ زندگی کے طویل سفر میں ان کے تطور و حرکت کی حدود وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے چاروں فقہوں کا نصب العین بلا اختلاف دین قیام عدل ہے جو بنیادی حیثیت سے پوری شریعت کا مدعا و مقصد ہے۔ پھر اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے جس شمع حقیقت کو دلیل راہ بنا کر ہر ایک اپنا سفر شروع کرتا ہے وہ بھی بالترتیب کتاب و سنت ہی ہے۔ اس شمع حقیقت کی روشنی معاملات و مسائل کے جن تاریک گوشوں تک براہ راست نہیں پہنچتی ان کے علم کے لئے ہر ایک اس نور عقل و بصیرت پر اعتماد کرتا ہے جو کتاب و سنت میں غور و فکر کی طویل جد و جہد کے بعد اس کو حاصل ہوا تھا۔ بوقت ضرورت عقل و رائے سے کام لینے کے سلسلہ میں چار فقہوں کے ظہور پر مافیہ کے متعلق یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے"۔

نئے درپیش مسائل کی کشودِ کار کے لئے کتاب و سنت کے علاوہ نور عقل و بصیرت کو جس نے بھی اپنا رہبر بنایا اس نے اس کی رہبری کا دائرہ اتنا ہی پھیلایا جتنا پھیلانا اس کو اپنے درپیش مسائل کے حل کے لئے درکار تھا۔ امام شافعی کا ایک زمانہ تک امام مالک کے مسائل سے وقتی اتفاق اور پھر اس میں سے ہٹ کر ایک دوسری راہ اختیار کرنا اس لئے نہیں تھا کہ اس وقت ان کا نقطۂ نظر امام مالک کے نقطۂ نظر سے بدل چکا تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ اس وقت جدید مسائل کے تقاضوں نے انھیں ایک نئے موڑ سے آشنا کیا تھا اور نیا اسٹینڈ لینے پر مجبور کیا تھا۔ ظاہر ہے عقل کی رہبری کا وہ دائرہ مصر میں کام نہیں دے سکتا تھا جو مدینہ میں کام دے رہا تھا۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد اگر امام مالک ان کے لڑکے کے پاس حاضر ہو کر ان کے والد کے مسائل وقتاً فوقتاً معلوم کرتے تھے تو اس کا سبب بھی یہ تھا کہ مدینہ میں وہ تغیرات پیدا نہیں ہو سکے تھے جن سے امام ابو حنیفہ کو پہلے ہی سابقہ پیش آ چکا تھا۔ اسی لئے ان کی وفات کے بعد جب امام مالک کو بھی ان بدلتے ہوئے حالات و مسائل سے دوچار ہونا پڑا تو انھوں نے بھی عقل کی کارکردگی کے دائرے کو ضرورت کے مطابق وسعت دی۔ لیکن ان چاروں فقہوں میں چونکہ فقہ حنفی ہی میں عقل و رائے اور اجتہاد و استنباط کی کوششیں زیادہ ہوئی ہیں اس لئے موجودہ دور میں جیسا کہ ضرورتوں کے تقاضے شدید سے شدید تر ہو گئے ہیں، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ چاروں فقہوں کی اجتہادی تفصیلات کو یکجا کر کے ان کو عصر نو کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے لیکن چونکہ فقہ حنفی کے استنباطی دائرے زیادہ وسیع ہیں اس لئے موجودہ دور میں جو فقہ مدون ہوگی اس میں فقہ حنفی کو ہی نمائندگی حاصل ہوگی۔ (مختصر)

وفات

مرحوم بغرض علاج سعودی عرب تشریف لے گئے تھے۔ شاہی اسپتال ریاض میں دل کے آپریشن کے بعد زیر علاج تھے اور روبہ صحت ہو رہے تھے کہ اچانک گردہ کا عمل بند ہو گیا اور ۱۹ / ۲۰ مارچ ۱۹۸۸ء کی درمیانی شب میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حرم شریف میں آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ولی اللہ سعیدی فلاحی

۱

عربی ادب

لفظ "ادب" کی تحقیق

لفظ "ادب" میں اصلی حروف ا، د اور ب ہیں۔ ادب کے معنی ہوتے ہیں لوگوں کو کھانے پر بلانا۔ اسی سے المأدبة و المادبة ہے۔ آدب: کھانے پر دعوت دینے والے کو کہتے ہیں۔[1] طرفہ[2] شاعر کا شعر ہے ؎

نحن فی المشتاة ندعو الجفلی — لاترى الآدب فينا ينتقر [3]

ہم لوگ سرما میں دعوت عام کرتے ہیں — تم ہمارے داعی کو صرف مخصوص لوگوں کو دعوت دیتے نہیں دیکھ سکتے

آدبة مأدبة اور المأدبة ہر اس کھانے کو کہتے ہیں جو شادی یا کسی بھی دعوت پر تیار کیا جائے۔ صخر الغی[4] عقاب کی تعریف میں کہتے ہیں۔

کأن قلوب الطیر فی قعر عشها — نوى القسب ملقى عند بعض المآدب [5]

گویا چڑیوں کے دل اپنے گھونسلے کے اندر — کسی دسترخوان کے پاس پڑی ہوئی کھجور کی گٹھلیاں ہیں

پھر یہ لفظ اپنے معنی حسی یعنی دعوة الی الطعام سے معنی ذہنی یعنی دعوة الی المحامد والمکارم کی طرف منتقل ہو گیا[6] چونکہ اچھی چیزوں کی طرف بلانا ایک اچھی صفت ہے اس لئے

---

[1] معجم مقاییس اللغة۔ ابو الحسین احمد بن فارس بن زکریا، جلد اول ص ۷۴ [2] طرفہ بن العبد بن سفیان بن سعد البکری الوائلی، ابو عمرو (۸۶ – ۶۰ ق ھ = ۵۳۸ – ۵۶۴ء تقریباً) جاہلی دور کے عربی شعراء کے پہلے طبقے میں ان کا شمار ہوتا ہے (الاعلام۔ خیر الدین الزرکلی جلد سوم ص ۲۲۵)

[3] دیوان طرفہ بن العبد ص ۹۳ [4] صخر بن عبد اللہ الخثعمی، بنو ہذیل کے تھے۔ جاہلی شاعر تھے (تلخیص کے لئے الاعلام۔ خیر الدین الزرکلی جلد سوم ص ۲۰۲)۔ [5] لسان العرب۔ ابن منظور جلد اول (ا، د، ب) ص ۲۰۶ [6] تاریخ الادب العربی۔ ڈاکٹر شوقی ضیف۔ العصر الجاہلی ص ۸ اور لسان العرب جلد اول (ا، د، ب) ص ۲۰۶

یہ لفظ ظرافت، عقلمندی اور اچھی عادت کے لئے استعمال ہونے لگا۔[1] پھر مزید کسی چیز کو اچھے ڈھنگ سے حاصل کرنے کے معنی میں بھی یہیں سے نکلا۔[2]

ادب کے مفہوم کی تعیین میں ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ اختلاف رہا ہے۔ دور جاہلی میں ادب کا مفہوم وہی تھا جو اوپر گزر چکا، یعنی دعوة الی الطعام۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اخلاق و تہذیب کے مفہوم میں استعمال ہوا۔ ایک حدیث میں ہے۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عال ثلاث بنات فادبهن و رحمهن و احسن اليهن فله الجنة۔[3]

ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے۔ انھوں نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس شخص نے تین بچیوں کی کفالت کی، ان کی تربیت و پرداخت اچھے ڈھنگ سے کی، انھیں مہذب بنایا، ان کے ساتھ رحمت و شفقت اور حسن سلوک کا معاملہ کیا تو ایسے شخص کے لئے جنت ہے۔

سہم بن حنظلة الغنوی[4] مخضرمی شاعر اسی مفہوم کو اس شعر میں یوں کہتا ہے:

لا یمنع الناس منی ما اردت ولا — اعطیهم ما ارادوا حسن ذا ادبا [5]

---

[1] القاموس الاسلامی۔ احمد عطیة اللہ۔ حصہ اول، ص ۵۱

[2] القاموس المحیط۔ الفیروزآبادی ص ۴۵

[3] مسند الامام احمد بن حنبل۔ جلد سوم ص ۹۷

[4] سہم بن حنظلة بن جاوان بن خویلد ...... = ... ۶۶۰ء تقریباً) غنی بن اعصر کے خاندان سے ہیں۔ مشہور شہسوار اور شاعر، اہل شام سے تعلق ہے۔ دور جاہلیت پایا ہے اور دور اسلام میں عبد الملک بن مروان کے زمانے تک زندہ رہے (الاعلام۔ خیر الدین الزرکلی جلد سوم ص ۱۴۲)

[5] الاصمعیات۔ اختیار الاصمعی ابی سعید عبد الملک بن قریب بن عبد الملک۔ ۱۲ بیت ۳۰ ص ۵۵

ادب کا یہ اخلاقی و تہذیبی مفہوم بنی امیہ کے دور تک رہا۔ اسی دور میں ادب تعلیمی مفہوم کی طرف بڑھا۔ معلمین کی ایک جماعت کو مؤدبین کہا جانے لگا۔ یہ لوگ خلفاء کے بچوں کو عربی ثقافت، اشعار، خطب، اخبار عرب اور ان کے انساب وایام (دور جاہلیت اور اسلام کے) وغیرہ کی تعلیم دیتے تھے۔ لہٰذا یہ لفظ علم کی جگہ پر بولا جانے لگا اور اس کا اطلاق علوم شریعت اسلامیہ یعنی فقہ، حدیث اور تفسیر قرآن پر بھی ہونے لگا۔[1]

احمد عطیۃ اللہ لکھتے ہیں کہ اسلام میں ادب کا اطلاق ان عظیم علوم پر ہونے لگا جو عقل کو جلا بخشتے ہیں خواہ وہ نظم ہو یا نثر، خصوصاً علوم دین جیسے تفسیر، فقہ، اور حدیث۔[2]

عہد عباسی میں لفظ ادب تہذیبی اور تعلیمی دونوں معنوں میں استعمال ہونے لگا۔[3] ابن المقفع[4] نے ملکوں اور اخلاقی وسیاسی نصیحتوں پر مشتمل دو کتابیں لکھیں اور ان کا نام "الادب الصغیر" اور "الادب الکبیر" رکھا۔ اسی مفہوم میں ابو تمام[5] نے دیوان الحماسۃ کے تیسرے باب کا نام "باب الادب" رکھا۔

اسی مفہوم کے پیش نظر بخاری[6] نے اپنی کتاب الجامع الصحیح میں کتاب الادب قائم کیا ہے۔

---

[1] تاریخ الادب العربی۔ دکتور شوقی ضیف۔ العصر الجاہلی ص۔ [2] القاموس الاسلامی۔ احمد عطیۃ اللہ جلد اول ص۔ [3] تاریخ الادب العربی۔ دکتور شوقی ضیف العصر الجاہلی ص۔

[4] عبداللہ بن المقفع (۱۴۲ھ/۷۵۹ء) سن وفات اور سن پیدائش تقریباً ۱۰۶ھ ہے۔ کلیلہ و دمنہ کے مترجم ہیں۔ تاریخ الادب العربی۔ احمد حسن الزیات ص۲۲۵-۲۲۶۔ [5] ابو تمام۔ عباسی دور کا شاعر۔ پورا نام ابو تمام حبیب ابن اوس بن الحارث الطائی۔ دمشق کے قریب صوبہ حوران کے جاسم (ایک قوم منبج) نامی گاؤں میں ۱۸۸ھ/۸۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۳۱ھ/۸۴۶ء میں موثق بن المعتصم کی خلافت میں آپ کا انتقال موصل میں ہوا۔ (القاموس الاسلامی۔ احمد عطیۃ اللہ جلد اول ص۲۹۵)

[6] ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن المغیرۃ بن بردزبہ۔ بخارا میں ۱۹۴ھ/۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ محدث ہیں۔ اصل نسل فارس کی ہے۔ سمرقند کے قریب ۲۵۶ھ/۸۷۰ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ (القاموس الاسلامی۔ جلد اول ص۲۹۳-۲۹۸)

اسی زمانے میں یعنی دوسری اور تیسری ہجری اور ان صدیوں کے بعد کی قرنوں میں بھی لفظ ادب کا اطلاق اشعار عرب اور اخبار عرب کی معرفت پر ہوتا تھا چنانچہ اسی مفہوم کے پیش نظر لوگوں نے کئی تالیف کیں "البیان والتبیین للجاحظ"[1] اس کی واضح مثال ہے۔ اسی طرح "الکامل فی اللغۃ والادب للمبرد"[2] ہے۔ اسی مفہوم میں کتاب عیون الاخبار لابن قتیبہ[3]، "العقد الفرید لابن عبد ربہ"[4] اور "الآداب للحصری"[5] ہے۔

اس کے بعد یہ لفظ تہذیبی اور تعلیمی معانی تک محدود نہیں رہا بلکہ ان تمام غیر دینی علوم و معارف کے لئے بولا جانے لگا جو انسانی زندگی کے اجتماعی اور ثقافتی پہلوؤں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر الحسن بن سہل[6] ادب کی دس قسمیں ذکر کرتے ہیں۔ تین شہرجانیہ یعنی لکھنا باری، شطرنج اور صوالج (چاندی) بازی، تین انوشروانیہ یعنی طب، ہندسہ اور گھوڑ سواری، تین عربی یعنی شعر، نسب اور ایام الناس اور ایک قصہ گوئی اور باہمی

---

[1] ابو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب۔ مولی ابی القلمس عمرو بن قلع الکنانی ثم الفقیمی۔ مزید تفصیل ملاحظہ ہو۔ معجم الادباء۔ یاقوت جلد ۶ ص۵۶-۸۰۔ سن وفات ۲۵۵ھ/۸۶۹ء ہے۔ (القاموس الاسلامی جلد اول ص۵)۔ [2] ابو العباس مبرد ۲۱۰ھ/۸۲۶ء — ۲۸۵ھ/۸۹۸ء تقریباً نحوی تھے۔ (المنجد فی الاعلام۔ لوئیس معلوف ص۵۱۹)۔ [3] ابو محمد عبداللہ (۸۲۸-۸۸۹) بہت بڑے ادیب ہیں کوفہ میں پیدا ہوئے، فقیہ اور محدث ہیں۔ (المنجد فی الاعلام لوئیس معلوف ص۱۲)

[4] ابو عمر شہاب الدین احمد بن محمد بن عبد ربہ بن حبیب بن حدیر بن سالم القرطبی۔ قرطبہ میں ۱۰ رمضان ۲۴۶ھ/۸۶۰ء میں پیدا ہوئے اور ۳۲۸ھ کو ۸۱ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ (العقد الفرید جلد اول تحقیق دکتور مفید محمد قمیحہ مقدمۃ المحقق ص ج)

[5] ابراہیم بن علی بن تمیم الانصاری، ابو اسحاق الحصری (... — ۴۵۳ھ = ... — ۱۰۶۱م) ادیب اور نقاد ہیں۔ قیروان کے رہنے والے تھے۔ (الاعلام خیر الدین الزرکلی جلد اول ص۵۱)

[6] الحسن بن سہل بن عبداللہ السرخسی۔ ابو محمد المامون العباسی کے وزیر تھے۔ بوران (مامون کی بیوی) کے والد تھے۔ سرخس، خراسان میں انتقال ہوا۔ (الاعلام خیر الدین الزرکلی جلد دوم ص۱۹۲)

مجالس کی باتیں۔[1] احمد عطیۃ اللہ نے اسی بنیاد پر ادب کی بارہ قسمیں گنائی ہیں۔ وہ یہ ہیں:
لغت، نحو، شعر، عروض، قافیہ، نحو، صرف، اشتقاق، معانی، بدیع،
محاضرات اور نثر۔[2]

ابن خلدون نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ادب کا اطلاق دینی اور غیر دینی تمام علوم و معارف پر ہوتا ہے۔

تیسری صدی ہجری سے یہ لفظ ان طور طریقوں اور سنن و آداب کے لیے ہونے لگا جن کا دائرہ بہت محدود تھا، جو صرف خاص لوگوں سے متعلق تھا۔ مثلاً ابن قتیبہ کے ادب الکاتب وغیرہ۔[3]

قرن حاضر کے وسط سے یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ ایک تو لٹریچر[4] کے معنی میں یعنی ہر وہ چیز جو لکھی جائے۔ خواہ وہ کسی بھی موضوع پر ہو یا کسی بھی اسلوب میں۔ دوسرا معنی ادب خاص کا ہے یعنی ایک ایسا کلام انشائی اور بلیغ جو قارئین اور سامعین کے عواطف پر اثر انداز ہو سکے۔ خواہ وہ نظم ہو یا نثر، جیسے اشعار، ادبی شہ پارے، انشائیہ، قصص وغیرہ۔[5]

---

[1] تاریخ الادب العربی۔ دکتور شوقی ضیف۔ العصر الجاہلی ص ۹

[2] القاموس الاسلامی۔ احمد عطیۃ اللہ جلد اول ص [illegible]

[3] اس کتاب میں ایک ادیب کو تخلیقی میدان میں پیش آنے والی ضرورتوں اور الفاظ و معانی اور مصادر کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات سے بحث کیا گیا ہے۔ (القاموس الاسلامی۔ احمد عطیۃ اللہ جلد اول ص ۸۱)

[4] LITTERATURE یہ فرانسیسی لفظ ہے۔

[5] تاریخ الادب العربی۔ دکتور شوقی ضیف۔ العصر الجاہلی ص ۷ اور ۱۰

ابوالاعلیٰ کا نثری سرمایہ

جناب صباح الدین ملک فلاحی

عظیم ادیب کا امتیاز

اردو کے دوسرے ادیبوں کے مقابلہ میں ابو الاعلیٰؒ کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے بالفاظ قرآن "شہادت حق" "اقامت دین" اور "اظہار دین" کے بلند ترین مقاصد کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا۔ یہ مقصد اس نے عقل و شعور اور دل و دماغ کی پوری آمادگی کے ساتھ اپنایا تھا۔ اس کی زندگی کا ہر سانس اور وقت کا ہر لمحہ اس مقصد کے لیے وقف تھا۔ یہ مقصد اس کی روح، اس کا دل و دماغ اور اس کا ایمان بن گیا۔ اس نے کائنات کے عظیم ترین حقائق، توحید، رسالت اور آخرت کو اپنا موضوع بنایا جن کی صداقت کی گواہی کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا تھا، جن کی تصدیق تاریخ انسانی کر رہی تھی، جن کی شہادت خود انسان کی فطرت دے رہی تھی اور جن کو تسلیم کرنے پر خود عقل مجبور تھی۔

پھر اقامت دین کے اس مقصد کے لیے تعلیم و تذکیر اور ابلاغ و اتمام حجت کی جو ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی، اس کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ ایسا اسلوب اختیار کریں جو براہ راست دلوں پر دستک دے جو دماغوں سے اپنی قوت اور حقانیت تسلیم کرائے اور انسان کا ضمیر و شعور اس پر صاد کرے۔ ابوالاعلیٰ کی یہی بیداری اور امتیازی خصوصیت ہے جو اس کی تحریروں میں روح بن کر دوڑ رہی ہے اسے ہم بقول اقبال "خون جگر"، بالفاظ ملٹن "LIFE BLOOD" اور میر امن کے مطابق "خون دل" کہہ سکتے ہیں۔ ابوالاعلیٰ کی نثر کے ہر ہر رگ و ریشہ میں یہ تازہ اور حقیقی خون گردش کر رہا ہے جو اعلیٰ ترین ادب کا واحد منبع ہے۔ ابوالاعلیٰ کی نثر کی دوسری خصوصیات در اصل اسی بنیادی خصوصیت کی دین ہیں۔

جدید زمانے میں اقامت دین کا بلند مقصد متقاضی تھا کہ وہ ایک طرف اپنی علوم کا گہرا

مطالعہ بھی [illegible] دوسری طرف جدید علوم و فنون اور جدید تحقیقوں سے بھی کما حقہٗ واقف ہوئے۔ اس قدر وسعت نے انھیں صحیح معنوں میں قدیم و جدید کا مجمع البحرین بنا دیا۔ غور و فکر اور فہم و فراست نے اس مطالعے کو جِلا بخشی۔

وہ اسلام پر ذہنی اور قلبی صحت پر ایمان لائے تھے اور دین کا واضح اور وسیع تصور رکھتے تھے جس کی وجہ سے وہ دین کو ایک معقول، متحد اور مربوط نظامِ زندگی مانتے اور اسی انداز میں پیش کرتے تھے۔

انھیں زبان و بیان پر بھی پوری قدرت تھی۔ وہ دہلی کے شرفاء اور ادباء کی زبان بولتے اور صحتِ زبان کا شدت سے اہتمام کرتے تھے۔ ان کی زبان پر "اردوئے مبین" کا اطلاق ہوتا ہے۔ ضرورت کے مطابق ایجاز و اطناب میں وہ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں ظرافت و ذکاوت (WIT) اور ان کی قوتِ متخیلہ نہایت جاندار (FERTILE) اور ان کے ذہن میں ایک خاص صفائی (CLEAR HEADEDNESS) ہے۔ ان کی طبیعت میں متانت اور سنجیدگی بھی ہے جو طنز و مزاح کو حدِ اعتدال میں رکھتی ہے۔ یہ تمام چیزیں ان کی تحریروں میں ہر جگہ نمایاں ہیں۔

نثری خصوصیات

یہ خصوصیات جن کا ہم نے اجمالاً نکات (POINTS) کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ آئیے انھیں ذرا پھیلا کر دیکھیں: اول — مولانا مودودی نے اپنی تصانیف میں ایجاز و اطناب کے اسالیب کو بہت خوبی سے برتا ہے جو اُن کی قدرتِ کلام اور صفائیِ ذہن کا بے مثل نمونہ ہے۔ جس بات کو وہ پھیلا کر بیان کرتے ہیں اس کے تمام گوشے شرح و بسط سے سامنے آجاتے ہیں اور جسے اختصار سے بیان کرتے ہیں اس میں موضوع کے تمام گوشے بھی آجاتے ہیں اور اہم استدلال کا رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے کئی ایک نمونے موجود ہیں:

• "الجہاد فی الاسلام" تو چھ سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب ہے اور "جہاد فی سبیل اللہ" جو ۴۸ صفحات کا ایک پمفلٹ ہے یا "اسلامی ریاست" جو کئی سو صفحات کی کتاب ہے اور "اسلام کا نظریۂ سیاسی" جو ایک مختصر پمفلٹ ہے یا پھر ان کی ریڈیائی تقاریر جو "اسلام کا نظامِ حیات" کے نام سے چھپ چکی ہیں، مختصر و جامع تحریر کے بہترین نمونے

ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ علوم و فنون کی ترقی نے اس زمانے کے مزاج کو تحقیقی و فکری کا خوگر بنا دیا ہے۔ مولانا مودودی اس ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے ہر زیرِ بحث مسئلے کا تجزیہ بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں اور اس کے ما لہٗ و ما علیہ پر بڑی تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ یہ "درازیِ تحریر" ان کی بیشتر تصانیف میں پائی جاتی ہے اور اس اطناب کی وجہ سے ان کی تحریر میں جا بجا تکرار بھی پایا جاتا ہے مگر یہ اظہار و بیان کی خوبیوں کی وجہ سے وجدان و طبیعت پر گراں نہیں گزرتی بلکہ بات جتنی پھیلتی جاتی ہے دل و دماغ اتنی ہی انبساط و کشادگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ وصف ان کی بالغ نظری اور علومِ جدیدہ سے آگہی کا نتیجہ ہے۔ مولانا کی مشہور تصنیف "پردہ" میں اس خوبی کو نمایاں طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔

دوم — مولانا مودودی مثالوں کے بادشاہ ہیں۔ اس فن میں انھوں نے "کیمیائے سعادت" اور "مثنوی رومی" کی تمثیلات کو بھی مات کر دیا ہے۔ وہ ادق مسائل کے لیے نہایت سادہ اور مؤثر مثالیں لاتے ہیں۔ اپنے معانی کی توضیح اور ابلاغ کے لیے ان کے ہاں ان کا استعمال بڑے وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ یہاں ہم صرف چند اشارات کریں گے۔ "تفہیمات" میں "عقل کا فیصلہ" کے زیرِ عنوان وجودِ باری تعالیٰ اور انبیائے کرام کے طریقِ ہدایت جیسے موضوع پر نہایت دل نشین اور مؤثر انداز میں بحث کی ہے اور تشبیہ و تمثیل کی مہارت دکھائی ہے۔ "سلامتی کا راستہ" میں جہاں وہ انسانی اعمال کے طبیعی اور اخلاقی نتائج پر گفتگو کرتے ہیں تو تمثیل کے اس فن کا استعمال کر کے وہ ایک خالص فلسفیانہ بحث کو عام فہم بنا دیتے ہیں۔ "بناؤ اور بگاڑ" میں قوموں کے عروج و زوال کے تاریخی قانون کو "باغ اور مالی" کی تمثیل سے اس طرح سمجھاتے ہیں کہ شرحِ صدر ہو جاتا ہے۔ پھر تفہیمات جلد دوم میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر تمثیل کے پیرائے میں جو تنقید مودودی صاحب نے لکھی ہے وہ ایک کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں تمثیل اور تعریض دونوں فن استعمال کیے گئے ہیں اور بڑی خاصے کی چیز ہے۔

سوم — مولانا مودودی کے یہاں بلا کی ذہانت ہے جو ان کی تحریروں میں بے ساختگی اور شوخی پیدا کرتی ہے۔ وہ طنز و مزاح کے فن کو بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بے شمار ایسی ترکیبیں ملتی ہیں جنھیں پڑھ کر انسان بے ساختہ

داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انھوں نے "اجتماعی ضمیر، عریاں فساد، بے تقریب قہقہے، پرتان، بعض اینگلو محمڈن مسلمان" جیسی ترکیبیں وضع کی ہیں۔ مرحوم لیاقت علی خان کی شہادت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ انوکھا انداز بیان اختیار کیا تھا کہ "اگر سیاسی معاملات کا فیصلہ "قوت شمشیر" کو سونپ دیا گیا تو یہ بہت بڑا سانحہ ہوگا کیونکہ یہ بڑا راشی منصف ہے۔ جو اس کو خون چٹا دے گا کام نکال لے گا۔"

عیسائی عالم کرسٹم سوسٹم کے تصور عورت کی ترجمانی کیسے جدید اور لطیف ترجموں میں کیا ہے۔ "ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک غارتگر دلربائی، ایک آراستہ مصیبت"۔ یہ لطائف اور شوخی مولانا کی تحریر میں سطر سطر پر نظر آتی ہے، لیکن بیان کی شوخی اتنی مدھم ہوتی ہے کہ حساس طبیعت بھی گدگدی محسوس نہ کرے، نہ اتنی تیز کہ انسان قہقہے مار کر ہنس پڑے۔ طنز و مزاح میں اس درجہ کا مناسب اعتدال کی مثالیں ہمارے ادب میں نایاب ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں تعلیم یافتہ مسلمان مغربی مقلدین پر، پرانے نظام تعلیم پر، یورپ سے اٹھنے والے فلسفوں اور تحریکات پر، خصوصاً کمیونسٹ نظام پر اور حکومت الٰہیہ کی مخالفت کرنے والوں پر جو تنقیدیں کی ہیں ان میں طنز و مزاح کی نادر روایات قائم کی گئی ہیں۔

عرب کے معاشرہ میں قحبہ گری کی ایک شکل کو یوں بیان کرتے ہیں: "دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ بعض جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے تھے جنہیں دیکھ کر دور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ "حاجت مند" آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔"

اپنے مطلب کے لئے قرآن کی تلاوت کرنے والوں کو طنز کا نشانہ بعض جگہ اس طرح بنایا ہے: "اگر ان کو قرآن پاک میں اپنے مفید مطلب کا کوئی ایک ٹکڑا بھی مل جائے تو سیاق و سباق سے صرف نظر کر کے بھی اس ایک ٹکڑے پر پورا [illegible] معنی متعین کر لیتے ہیں۔"

امیدواری کے حق میں کچھ لوگوں نے انی جاعلک للناس اماما سے استدلال کیا۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: "مگر کچھ اللہ کے بندے دنیا میں ایسے ہیں جنھوں نے اس آیت کو بھی امامت کی امیدواری اور ریاست کی طلب کے لئے دلیل جواز کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے

نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ "یا اللہ متقی لوگوں کو ہماری رعیت اور ہم کو ان کا حکمران بنا دے" اس معنی ہی کو وہ "امیدواروں" کے سوال کو قوت دے سکتا ہے۔"

اشتراکیت اور مغربی الحاد اور لادینیت سے جماعت اسلامی کے ٹکراؤ کے پس منظر میں علماء کے ایک گروہ کی مخالفت کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ "جماعت اسلامی کا اصل تصادم انہی دو طاقتوں سے ہے۔ علماء کرام خواہ مخواہ بیچ میں آ کھڑے ہوئے ہیں یا "گویا" بنا کر لا کھڑے کئے گئے ہیں۔"

مودودی صاحب کے خطوط میں بھی بڑے لطیف جملے ملتے ہیں۔ چند جملے ملاحظہ ہوں: "تاہم مرافقہ کے معنی میں بھی اس کو مونث بولنا غلط نہیں ہے۔ انگریزی میں ناؤ کی جنس ویسے ہی مشتبہ ہے۔" "زنا کے متعلق آپ کو مطمئن کرنے کے لئے اب میں یہی کر سکتا ہوں کہ اس لفظ کا استعمال کرتے ہوئے جملے کی ترکیب ایسی رکھوں کہ یہ حرکت نہ مونث رہے نہ مذکر۔ جو کام مونث و مذکر مل کر کریں اس کا بھی خنثیٰ ہونا چاہیے۔"

ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔ دیکھئے ذکاوت نے اس فقرہ کو کیسا حسن عطا کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں "جس طرح عداوتوں میں سب سے زیادہ خطرناک وہ گمراہی ہے جو ہدایت کے لباس میں جلوہ گر ہو۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں "عام طور پر جب غیر مسلم مشاہیر کی جانب سے اسلام کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار ہوتا ہے تو مسلمان بڑے فخر سے ان خیالات کو شہرت دیتے ہیں گویا ان کا اسلام کو اچھا کہنا اسلام کے لئے کوئی سرٹیفکیٹ ہے۔"

مولانا کے طنزیہ انداز نگارش کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ متانت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے اور اپنے اسلوب اور مردمی کو غلط آہنگ نہیں ہونے دیتے۔ وہ فتووں پر سرسید کی طرح قہقہہ تو نہیں لگا سکتے لیکن جواب دینے میں اعتدال سے نہیں گزرتے۔ یہ توازن طنز میں ایک شان پیدا کر دیتا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے ایک فتوی کے بارے میں وہ یوں لکھتے ہیں:

"سب سے نمایاں چیز جو مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے بیان میں نگاہ کو کھٹکتی ہے

وہ ان کی زبان سے جیسے ممکن ہے مولانا خود اپنے شایانِ شان سمجھتے ہوں مگر ہم ان کے ساتھ اتنا حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ زبان ہیں ان کے مرتبہ سے فروتر نظر آتی ہے۔"

اسی تحریر میں مودودی صاحب اپنی ذہنی "تلملاہٹ" کا اظہار بھی کرتے ہیں مگر کیسی شائستگی کے ساتھ: "میں پوچھتا ہوں، کیا مذہبی پیشوائی کی ایسی ہی موروثی مسند پر بیٹھ کر ایک مفتیِ عام کی یہ روش ہونی چاہیے؟ کیا تقویٰ اور دیانت اسی چیز کا نام ہے؟ کیا یہی وہ تزکیۂ نفس ہے جس سے حضرت خود بہرہ مند ہیں اور دوسروں کو بہرہ مند فرما رہے ہیں؟"

غرض انھوں نے طنز و مزاح کو بھی ایک نئی روایت دی ہے جو اعتدال اور شائستگی کا کامل نمونہ ہے۔

چہارم۔ جہاں تک قوتِ استدلال کا تعلق ہے، اس صنف میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ اس مقام پر وہ خود ہی اپنا جواب ہیں۔ وہ جب کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو اس سے متعلق تمام شکوک و شبہات، اور الجھنوں کو زبان و بیان کی تمام خوبیوں سے صاف کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر اس کی تائید میں جتنے حقائق جس گوشے سے بھی ملتے ہیں فراہم کرتے ہیں۔ وہ کسی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے قدیم مشرقی منطقی پیرایہ اختیار نہیں کرتے جس سے مخاطب خاموش ہو جاتا ہے مگر مطمئن نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں مولانا مودودی منطقی اور معقول دلائل لانے کے قائل ہیں۔ کہ قاری یا فریقِ مخالف کو ان کے موقف کے حق ہونے میں کوئی شبہ نہ رہ جائے۔ وہ جب کسی مسئلہ میں کسی کی تردید کرتے ہیں تو غیر معمولی قوت کے ساتھ اس کی دلیلوں کو توڑتے ہیں اور پھر اس "شکست و ریخت" کے بعد خود اپنے علم اور افکارِ صالحہ کی ایک عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ ان کا قلم فصد کا نشتر ہے، اور جراح کا مرہم۔ جاہلیت پر ان کی جو ضرب پڑتی ہے وہ شاہ ضرب MASTER STROKE ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں پڑھ کر بڑے بڑے کمیونسٹوں اور کٹر دہریوں نے اپنے معتقدات کی دنیا میں دھماکہ محسوس کیا ہے اور وہ اپنی جگہ سے ہل گئے ہیں۔ دینی مسائل میں مولانا مودودی کے قلم نے فاتح اور مجاہد کا پارٹ ادا کیا ہے۔ دلائل کے معاملہ میں وہ دھاندلی، ختم کنی اور ایچ پیچ سے کام نہیں لیتے۔ اپنے فریقِ مقابل OPPONET کو خروج کا زیادہ سے زیادہ موقع MARGIN یا ALLAWANCE

دے کر خود "بر سبیلِ تنزل" کا موقف اختیار کرتے ہیں مگر ان کے ہاں عقلی دلائل کی وہ قوت ہوتی ہے کہ تحریر میں انھی کی بات فائق تر معلوم ہوتی ہے اور وہی غالب نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ بے پردگی، سود، ضبطِ ولادت، انکارِ حدیث، اشتراکیت، قوم پرستی، شرک، بدعت، مغرب زدگی، غرضیکہ جاہلیت کے ہر محاذ پر دلائل و براہین سے مسلح اور کیل کانٹے سے لیس نظر آتے ہیں۔

نثری سرمایہ کا جائزہ

ان تفصیلات کی روشنی میں اب اگر ہم ان کے نثری سرمایہ کا جائزہ لیں تو انھیں ہم ۶ دائروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک مضامین یعنی تحریریں، جو کسی ایک موضوع کے ایک پہلو کو پوری وضاحت سے پیش کرتی ہیں۔ دوسرے مقالات، جو اکثر اتنے طویل ہوتے ہیں کہ پوری کتاب ہو گئے ہیں جیسے "پردہ" اور "اسلامی تہذیب"۔ تیسرے خطبات جو ان دونوں قسم کی تصانیف سے اس معنی میں مختلف ہیں کہ ان کو پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ ایک مجمع کو ایک معین وقت میں سمجھانے کے لئے لکھا گیا۔ چوتھے ترجمے، جو عربی اور انگریزی سے کئے گئے ہیں۔ مثلاً قرآن پاک کے ترجمے نیز دوسری کتب اور مقالات کے ترجمے۔ پانچویں کتابوں پر نقد و تبصرے، مقدمات اور تقریظات، چھٹے خطوط مثلاً رسائل و مسائل اور مکاتیب وغیرہ۔

مضامین

مضامین کے سلسلہ میں "تفہیمات" اردو نثر نگاری کا بڑا کارنامہ ہیں۔ یہ ہمیں سرسید کے تہذیب الاخلاق کے مخصوص مضامین کی یاد دلاتے ہیں۔ نثر نگاری کا مقصود، فہم و تفہیم ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں "فہم" کی کارفرمائی ہر ہر قدم پر نظر آتی ہے۔ فہم کے کرشمے کو فنِ نثر میں جلوہ فگن دیکھنے کے لئے بہترین مضامین "ہدایت و ضلالت، رواداری، آزادی کا اسلامی تصور، اور "ڈارون کا نظریہ ارتقاء" ہیں۔ "ہیگل اور مارکس کا فلسفۂ تاریخ" اس معاملہ میں معرکہ کی چیز ہے۔ آیئے اس کا جائزہ لیں۔ مضمون کا پہلا جملہ ہی پورے موضوع اور مصنف کے نقطۂ نظر کو اس انداز میں پیش کر دیتا ہے:

"جدید تہذیب جو عظیم الشان گمراہیوں کا سیلاب نوعِ انسانی پر امڈا لائی ہے، اس کے فکری اور نظری سرچشموں میں سے ایک بڑا سرچشمہ وہ فلسفۂ تاریخ ہے جس کو ہیگل نے مرتب کیا

اور جس کے مقدمات پر بعد میں کارل مارکس نے اپنی مادی تعبیر تاریخ کی بنا رکھی ہے:

اس فقرہ میں جو نظریہ جھلک رہا ہے وہ اسلام کا دین ہے۔ یقین و اعتماد کی کیفیت مصنف کے اپنے نقطۂ نظر اور مطالعہ پر اعتماد کا نتیجہ ہے۔ تخیل کی کار فرمائی صرف اس قدر ہے کہ سیلاب کی تشبیہ اور سرچشمہ کا استعارہ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے جملہ میں کچھ شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس جملہ کو پڑھ کر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جس نظریہ کی یہاں وضاحت ہوئی وہ کتنا اہم ہو گیا ہے۔ یہ جملہ خود کوئی وضاحت نہیں کرتا بلکہ فصاحت کے لئے زمین تیار کرتا ہے اور اس کے بعد ہی وضاحت شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد چھ پیراگراف میں ہیگل کے فلسفہ کو اس طرح پیش کر دیا جاتا ہے کہ پوری بات سمجھ میں آ جاتی ہے اور اس کی بابت کسی غلط فہمی اور شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ پھر تمام باتوں کو سمیٹ کر ان الفاظ میں پیش کر دیا جاتا ہے:

"ہیگل کے اس نظریہ کی رو سے جدلی عمل ایک کلی اجتماعی عمل ہے یعنی تاریخ کے ایک دور کی پوری انسانی تہذیب گویا ایک زندہ جسم یا ایک واحد وجود کی حیثیت رکھتی ہے اور افراد اور گروہ گویا اس جسم کے اعضاء یا اجزاء ہیں۔ اپنے دور کے اجتماعی مزاج یا اپنے دور کے تمدن و تہذیب کی ہمہ گیر روح سے کوئی فرد اور گروہ آزاد نہیں ہو سکتا۔ بڑے سے بڑا آدمی، نامور ترین اشخاص تک اس جدلی کھیل، اس عمل کی کشمکش یا خود میں شطرنج کے پیادوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس دریا کے طوفانی بہاؤ میں "خیال مطلق" ایک شاہانہ شان کے ساتھ بے روک ٹوک تاریخ کی شاہراہ پہ خود ہی دعویٰ، خود ہی جواب دعویٰ بالآخر خود ہی امتزاج بین الاضداد کرتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ "عقل کل" یا "جان جہان" کی ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اشخاص اور گروہوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے کہ اس تاریخی ڈرامہ میں وہ بجا بجانہ اور کار فرمایانہ پارٹ ادا کر رہے ہیں حالانکہ در اصل جان جہان انہیں خود اپنی تکمیل ذات کے لئے استعمال کر رہی ہے۔"

اس اقتباس میں ہمیں "جدلی عمل" "کلی اجتماعی عمل" کے معنی خیز عقلی فقرے ملتے ہیں۔ پھر تہذیب کو جسم انسانی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ بڑے بڑے آدمیوں کو شطرنج کی مہریاں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک زوردار جملہ آتا ہے جو "خیال مطلق" کی رفتار دکھاتا ہے۔ "جانِ جہان" کا جملہ اپنے اندر تنہا دلکشی رکھتا ہے۔ اس کی ستم ظریفی کے ارشاد کو بھی اس انداز میں

بیان کیا جاتا ہے کہ ذہن کو ایک خاص لطف ملتا ہے۔ اس انداز میں قاری کے لئے ایک کشش ہی پورے مضمون پر جادو کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ قاری اسی اثر کے تحت مضمون پڑھتا جاتا ہے اور پھر مرکز مضمون پر پہنچتا ہے۔ یہاں اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی حیثیت کی وضاحت ہوتی ہے۔ "انسان وہ روحانی وجود ہے جو اس اوپر کے حیوانی خول کے اندر رہتا ہے اور اخلاقی احکام کا حامل ہے۔" عقل بلا تکلف اس بات کو باور کر لیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الفاظ نے ذہن کو اپنی کنجی سے کھول دیا اور ایک بڑی حقیقت بے نقاب ہو گئی۔ آگے بتایا جاتا ہے کہ "رہا باہر کا حیوان تو وہ اصل وہ اس اندرونی انسان کو خادم اور آلۂ کار کے طور پر دیا گیا ہے۔" اور آخر میں ایک ایسی بات کہی جاتی ہے جو ہیگل، مارکس اور اسلامی فلسفوں کا قیاتی تمیز امتزاج نظر آتی ہے:

"اس طرح تاریخ کے دوران میں انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء ایک ایسے خط منحنی کی شکل میں ہوتا ہے جو بار بار ایک خط مستقیم کے گرد چکر کاٹتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مثال کچھ اس نقشہ کی سی ہے (ا [illegible] ب)

اس مثال میں ا – ب انسانی زندگی کا وہ فطری راستہ ہے جسے قرآن صراط مستقیم، رشد، ہدایت، سواء السبیل اور سبیل رب وغیرہ سے تعبیر کرتا ہے۔ ابتداءً انسان اپنی فطری حالت پر تھا (وکان الناس امۃ واحدۃ) پھر انسانوں میں اپنی اس حالت کو بدلنے کے میلانات پیدا ہوئے (وما اختلف فیه الا الذین اوتوه من بعد ما جاءتهم البینات بغیا بینهم) یہ میلانات انسان کو بار بار صراط مستقیم سے ہٹا کر دور لے جاتے رہے ہر بار تجربات کی تلخی اور انسانی فطرت کی بے چینی اس کو فطرت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کرتی رہی مگر انسان راہ فطرت پر پہنچ کر پھر دوسری طرف نکل جاتا رہا اور پھر فطرت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوتا رہا۔

ہیگل جس کو دعویٰ اور جواب دعویٰ کہتا ہے وہ دراصل انتہا پسندانہ میلانات ہیں جو کبھی خط مستقیم کے اس طرف اور کبھی اس طرف انسان کو کھینچ کر لے جاتے رہے ہیں اور وہ جسے ترکیب و امتزاج سے تعبیر کرتا ہے وہ دراصل وہ نقطے ہیں جہاں یہ خط منحنی صراط مستقیم کو کاٹتا ہے۔"

یہاں یہ تخیل اور بھی حسین ہو گئی ہے۔ اس میں وضاحت کے ساتھ ساتھ سائنسی مثال بھی ہے۔ اس کو پڑھ کر ہم تخیل کی دنیا میں نہیں جاتے بلکہ عقل کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ پورے مضمون پر تخیل کا جلوہ نظر آتا ہے۔ منطقی ربط [illegible] اس طرح کہ پڑھنے والے کی [illegible] منزل مقصود تک پہنچتی جاتی ہے۔

(باقی آئندہ)

تجزیہ

روس میں جنگِ افغانستان کے اثرات

تلخیص و ترجمہ: جناب فیض احمد شہابی صاحب ۔ ادارہ معارف اسلامی منصورہ، پاکستان

افغانستان میں مداخلت کے بعد روسی فوجیوں کو جس ہلاکت سے گزرنا پڑا ہے اس پر روس کے عوام میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ جذبات میں ویسی شدت تو نہیں جو جنگِ ویت نام کے خلاف امریکی شہریوں نے دکھائی تھی، لیکن عام روسی اس طویل اور بے مقصد آویزش سے اکتایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قومی، علاقائی و مذہبی پس منظر میں نفرت کی جو مختلف گہرائیاں موجود ہیں روسی حکمران ان سے بخوبی واقف ہیں۔ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ بعض قومی ریاستوں نے جنگِ افغانستان کے خلاف مختصر احتجاجیے تک جاری کیے ہیں۔ اگرچہ سوویت یونین کے بے رحم نظام میں کسی سیاسی تحریک کا ابھرنا تقریباً ناممکن دکھائی دیتا ہے لیکن جنگِ افغانستان ایک ایسا ناسور بن کر رہ گئی ہے جس پر روس کے عوام مشتعل ہیں۔ ماسکو کے دانشور سرجی ٹوانسکی کا کہنا ہے:

"یہ جنگ ہماری معیشت پر بوجھ ہے۔ ہمارے بھائی بند اس میں مر رہے ہیں۔ نچلے درجے کے مزدور، کسان ہوں یا حکومتی کارپرداز، سبھی اس سے نالاں ہیں۔" ٹوانسکی کے مطابق "اس جنگ کے خلاف کسی طاقتور تحریک کا اٹھنا فی الحال ممکن نہیں۔ امریکہ کے مقابلے میں یہاں جبر و تشدد کا راج ہے۔ ان حالات میں عوام میں سیاسی تحریک برپا کرنے کا شعور اور حوصلہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے باوجود سوویت حکومت لوگوں کے جذبات سے بے خبر بھی نہیں۔"

بالٹک کی جمہوریتیں، یوکرین اور وسط ایشیا کے عوام افغانستان میں روس کی مداخلت سے خاص طور پر برہم ہیں۔ یہ برافروختگی اس لحاظ سے بجا ہے کہ یہی ہتھکنڈے استعمال کر کے روس ان ریاستوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہوا تھا۔ سرجی ٹوانسکی اس بارے میں وضاحت کرتے ہیں:

"افغانستان میں فوجی مداخلت کے بعد وہ طبقہ نہایت پریشان ہے جس سے رنگروٹ بھرتی کیے جاتے ہیں۔ بعض ریاستوں میں حکومت کے خلاف کھلی مزاحمت اب معمول بن چکی ہے۔ حکومت اپنے

ارادے سے باز نہیں آتی اور احتجاج کرنے والوں کو بے دردی سے کچل دیتی ہے۔"

کچھ بھی ہو، جنگِ افغانستان روس اور اس کے عوام دونوں کے لئے دردِ سر بن چکی ہے۔ اس نے وہاں کے عوام کو بیدار کر دیا ہے اور نیا شعور عطا کیا ہے۔ یوکرین کے رسالے "رڈیونگ" (شمارہ ۸۲، ۱۹۸۵ء) نے یوکرین کے ساحلی شہر اوڈیسہ کے بارے میں لکھا: "جنگِ افغانستان سے یہاں کے لوگ اتنے گھبرا گئے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسے جیتنا ممکن نہیں ہے۔" ریڈیو لبرٹی نے بھی ایک سروے کے ذریعے انکشاف کیا ہے کہ روس کے ۲۵٪ شہری اس بارے میں حکومتی پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں۔

۱۹۸۲ء تک سوویت پریس نے یہ بتانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ روس افغانستان کن کارروائیوں میں الجھا ہوا ہے۔ محاذِ جنگ سے ایک روسی سارجنٹ نے "پراودا" (۱۰ فروری ۱۹۸۴ء) کو ایک خط لکھا: "میں اس بات پر حیران ہوں کہ ہماری حکومت جنگِ افغانستان کے بارے میں حقائق بیان کرنے سے کیوں کتراتی ہے، حالانکہ روسی شہری اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر یہاں اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔"

روس کے جنگی نقصانات پر نظر ڈالنے سے حقیقت واضح ہوتی ہے۔ وزارتِ دفاع کے خفیہ اعداد و شمار کے مطابق صرف ستمبر ۱۹۸۰ء میں ۸۴۹۲ روسی سپاہی ہلاک اور ۱۵۰۰۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ اب سے دو برس پہلے جنگ میں کام آنے والے ایک روسی افسر کی ڈائری ملی۔ اس میں ہلاک اور زخمی ہونے والے روسیوں کی تعداد ۴۲۰۰۰ ـــ ۳۲۰۰۰ کے قریب درج تھی۔ مجاہدین سے آ کر ملنے والے ایک یوکرینی منحرف فوجی نے انکشاف کیا کہ ان کے کامریڈ ہلاک ہونے والوں کی تعداد لگ بھگ ایک لاکھ بتاتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اتنے روسی فوجی ہلاک تو نہیں ہوئے البتہ یہ تعداد چالیس پچاس ہزار سے کم نہیں۔ لیتھونیا سے چھپنے والے ایک زیرِ زمین رسالے اوسرا (شمارہ ۳۰) میں درج تھا: "سرکاری ریکارڈ کے مطابق ۳ برسوں میں روس کے تیس فی صد فوجی جنگ میں ہلاک یا زخمی ہوئے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تعداد چالیس ہزار سے کم نہیں۔

ستمبر ۱۹۸۵ء میں حکومت کے ایک اعلیٰ نمائندے وی۔ آئی۔ چیستاکوف نے سیاسی تعلیم کے ایک ادارے میں تقریر کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ جنگِ افغانستان میں ہر سال پندرہ ہزار

فوجی بھی جانیں دے دیتے ہیں۔ ماسکو کی خاتون سیلز کلرک نے اپنی ایک سہیلی (جو شرمیتوو ہوائی اڈے پر کام کرتی ہے) کے حوالے سے بتایا کہ ایک اسپیشل ہوائی جہاز روزانہ کابل سے ایک سو کے قریب تابوت لاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جنگِ افغانستان میں مرنے والے روسیوں کی تعداد چھتیس ہزار سالانہ کے لگ بھگ ہے۔ روسی شہری ان جانی نقصانات پر سیخ پا ہیں۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں قازق مسلمان فوجیوں کی لاشیں مناسب تجہیز و تکفین کے بغیر دفنانے پر الما عطا میں زبردست مظاہرے ہوئے تھے۔ حالیہ برسوں میں جب کہ جانی اتلاف کئی گنا بڑھ چکا ہے روسی حکام عوام کے غیظ و غضب کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں اور سینکڑوں لاشیں روس لانے کے بجائے وہیں افغانستان میں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔

ہلاکت کی خبریں دوستوں اور رشتہ داروں پر بجلی بن کر گرتی ہیں۔ جولائی ۱۹۸۵ء میں مرمنسک میں تعینات ایک روسی فوجی کو یہ خبر ملی کہ اس کا بھائی جنگ میں مارا گیا ہے تو وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ بعد میں اس نے گیریژن سے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں خاباروسک کے قصبے میں ایک عورت نے خودسوزی کر لی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ میں مرنے والے اپنے بیٹے کی لاش حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔

روسی نوجوان فوج میں بھرتی ہونے سے ڈرتے ہیں۔ ماسکو کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ایسے نوجوان بیماری کا بہانہ بنا لیتے ہیں، خود کو زخمی کر لیتے ہیں اور بعض تو زہر کھا کر خودکشی کی کوشش کرتے ہیں۔ یروسلاو کے ایک ڈاکٹر کے مطابق "ملٹری رجسٹریشن آفس پر افغانستان نہ بھیجنے کے لیے بھاری رشوتوں کی پیشکش کی جاتی ہے۔ ایک شخص نے اپنا ذاتی مکان اور کار اس شرط پر دینے کی پیشکش کی کہ اس کے بیٹے کو افغانستان نہ بھیجا جائے۔" حکومت نے اس سردردی سے بچنے کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔ اب ایسے یتیم بچے جنگ میں جھونکے جا رہے ہیں جن کا والی وارث کوئی نہیں۔

روس میں خفیہ چھپنے والے پرچوں (SAMIZ DAT) میں جنگِ افغانستان کے خلاف جذبات کا حقیقی اظہار روزمرہ کی بات ہے لیکن اب ملک کے طول و عرض میں ایسے غیرقانونی ٹیپ شدہ المیہ گیت گردش کر رہے ہیں جنہیں خفیہ مقامات پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ یہ گیت ان فوجیوں نے لکھے ہیں جو افغانستان میں لڑ رہے ہیں۔ ان گانوں کے ذریعے وہ اس انجانی جنگ

کے علاوہ نیویارک سے شائع ہونے والے ایک روسی زبان کے اخبار میں چھپ چکے ہیں۔ اندازہ ہے کہ اب تک .... روسی فوجی افغانستان میں اپنی خدمات کا انجام دے چکے ہیں۔ یہاں کا یہ عالم ہے کہ جنگ کے خلاف روسی فوج خود افغانستان میں ایک خفیہ پرچہ (KRASNAYA ZVEZDA) نکالتے رہے ہیں۔ ۱۹۸۲ء کے آخر میں کابل میں اس کی جو کاپیاں تقسیم ہوئیں ان کا عنوان تھا "جنگ بند کرو۔ ہمیں اپنے گھروں کو جانے دو۔" ساتھ ہی ایک فوجی کی تصویر بنی ہوئی تھی جو بندوق کا شکوفہ توڑ رہا تھا۔ سرجی خوانسکی کا خیال ہے کہ افغانستان کے باشندوں کو جس بے دردی سے کچلا گیا ہے اس سے روسی فوجیوں کے گرتے ہوئے مورال کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ جانی نقصانات جتنے بڑھتے ہیں جنگ کی مخالفت بھی اتنی ہی تیز ہوتی ہے۔

وطن لوٹنے والے فوجی روسی حکام کے لیے مسئلہ بنتے جا رہے ہیں۔ وہ خفیہ چھپنے والے اخبارات کو انٹرویو دیتے ہیں اور جنگ کی ہولناکی کے قصے جا بجا بیان کرتے ہیں۔ فوج کے باغی کمان کے لیے جنگ سے عام نفرت ایک قضیہ بن چکی ہے۔ خطرہ ہے کہ ان احساسات نے سیاسی تحریک کی صورت اختیار کر لی تو یہ پورے سوویت معاشرے کو تلپٹ کر دے گی۔ سماجی پہلو کے ایک اعلیٰ روسی افسر نے تسلیم کرتے ہوئے کہا "افغانستان سے لوٹنے والے فوجیوں کے احساسات کا اندازہ ہمیں گزشتہ دو تین برسوں میں ہوا۔ وہ تھکے ماندے اور ذہنی طور پر مفلوج نظر آتے ہیں۔ لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔" اگرچہ جنگِ افغانستان کے فوجیوں کو اب جنگِ عظیم دوم میں حصہ لینے والے سابق فوجیوں کے برابر مراعات مل گئی ہیں، اس کے باوجود مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ انھوں نے فوجی انداز میں "رضاکار دستے" بنا لیے ہیں جو سماج دشمن قوتوں کے مقابلے میں "عدل و انصاف فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" یہ کارآزمودہ فوجی روس کے نظامِ زندگی اور اس میں پائی جانے والی خرابیوں (رشوت، نوکرشاہی اور مغربی طرز کی فیشن زدگی) سے سخت متنفر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ گرے ہوئے معاشرے میں اخلاقی طور پر بدتر ہیں۔ اب تو انھوں نے [illegible] نوجوانوں کو تربیت دینی شروع کر دی ہے کہ بلیک مارکیٹ کرنے والوں، رشوت خور افسروں اور منشیات کے سوداگروں سے کیسے نمٹا جائے۔ پہلے وہ ان کی سرگرمیوں [illegible] وہ خود کو قانون نافذ کرنے والے اداروں [illegible] اپنے تو [illegible]

نافذ کرنا چاہتے ہیں؟" اخبار کے مطابق افغانستان سے آنے والے ان فوجیوں کے منظم گروپ بڑے بڑے شہروں مثلاً ماسکو، نووسبرسک اور پودپیتروسک میں موجود ہیں۔

جنگِ افغانستان سے نفرت کا اندازہ روس میں خفیہ چھپنے والے پرچوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ستمبر ۱۹۸۱ء میں تو قرقاش کے شہر میں ایک اشتہار منظرِ عام پر آیا۔ اس میں شہریوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ روس کی بیرونی مداخلت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ ایک ماہ بعد ماسکو میں اسی نوعیت کا پوسٹر چھپا اس پر یہ نعرہ درج تھا "پولینڈ اور افغانستان کو آزاد کرو"۔ لینن گراڈ سے سمرقند تک یہ اشتہار اب روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔

۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے افغانستان سے بیرونی فوجی دستے واپس بلانے کی قرارداد منظور کی۔ ماسکو ہلسنکی نگران گروپ نے اس موقع پر اپنے تائیدی بیان میں کہا "روس کو بنیادی انسانی حقوق ناپسند ہیں۔ وہاں کی لیڈرشپ اسے قبضے کرنا آتی ہے جس کے دور رس اثرات تمام دنیا کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ عظیم ترین ریاست جس طرح شخصی حقوق کا خیال نہیں کرتی، اپنے لوگوں، ہمسایوں اور بالآخر دنیائے انسانیت کے لئے ایک خطرہ بن گئی ہے"۔ اس بیان پر دوسروں کے علاوہ معروف روسی منحرف آندرے سخاروف نے بھی دستخط کئے تھے۔ گورکی میں جلاوطنی سے پہلے انھوں نے بی بی سی نیوز کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ دہرایا۔ پابندی کے باوجود سخاروف کی چند تحریریں بیرونی دنیا میں پہنچیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں بتایا "فیصلے کرتے وقت قومی رہنماؤں کو یاد رکھنا چاہئے"۔ ان کے عوام غالباً یہ کا حق رکھتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ افغانستان پر چڑھائی کا فیصلہ کس نے کیا اور کیوں کیا۔ ہماری سیاست کا دردناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے قائدین صلح اور جنگ کے معاملے میں کسی کی رائے قبول نہیں کرتے۔ یہ بھی سمجھ کہ یہاں تنقید کا گلا دبا دیا گیا ہے"۔ روس کے اندر سے اس آواز نے افغان مجاہدین کو ایک نیا حوصلہ عطا کیا۔ انھوں نے روسی حکمرانوں سے کہا کہ وہ سخاروف کی آزادی کے بدلے میں روس کے بعض جنگی قیدی رہا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ روس کی جانب سے مجاہدین کی اس پیشکش کا جواب نہیں آیا۔

انسانی حقوق کی بحالی کے لئے روس میں متعدد تنظیمیں سرگرم ہیں۔ جون ۱۹۸۰ء میں استونیا میں

کسی "نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ" کی جانب سے .... ایک میمورنڈم چھپا۔ خلاصہ یہ تھا: "اس میں شبہ نہیں رہا کہ ہمارا ملک ایک بہت بڑی سامراجی قوت ہے۔ سرحد پار کی دوسری آزاد قوموں پر استعماری ہتھکنڈے اس کا معمول بن چکے ہیں"۔ ۱۹۸۰ء کے موسمِ گرما میں لینن گراڈ کی ایک تنظیم کی دو خواتین نے روسی نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ افغانستان لڑنے کے بجائے جیل جانے کو ترجیح دیں۔ اس پر روسی حکومت اتنی بگڑی کہ ان خواتین کو گرفتار کر کے جبری طور پر ملک سے نکال دیا۔ مئی ۱۹۸۰ء میں لینن گراڈ "ماریا کلب" کی "افغان خواتین کمیٹی" نے ایک قرارداد منظور کی۔ اس میں کہا گیا تھا "ہم خواتین اپنے ان حوصلہ مند بھائیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں جو جنگ، تشدد اور بے انصافی کے خلاف مصروفِ عمل ہیں"۔ جون ۱۹۸۱ء میں بچوں کے بین الاقوامی دن پر "تحریکِ امن" کے ایک رکن سرجی بٹرانسکی کی ایک اپیل منظرِ عام پر آئی۔ "ایک اشتراکی ملک میں ایک جمہوری تحریک کو مزاحمت سمجھ کر کچل دینا غیر فطری لگتا ہے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود یہ تحریک ہلاکت خیز ہتھیاروں، افغانستان میں مرنے اور زخمی ہونے والے افغان بچوں اور روس جاری تباہ کن جنگ کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھے گی"۔

۱۹۸۲ء میں ماسکو میں جنگِ افغانستان کے خلاف پہلا بڑا مظاہرہ ہوا۔ پولیس نے مظاہرین کو منتشر کر دیا۔ پکڑ دھکڑ دو دن جاری رہی۔ تقریباً دو سو افراد جیل میں بھیج دیئے گئے۔ ایک غیر سرکاری تنظیم کے نمایاں رکن اشٹر زنسکی اسی سال اکتوبر میں زیرِ حراست لئے گئے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے روسی توسیع پسندی کی مذمت کی تھی۔ حکومت نے زنسکی پر یہ الزام بھی دھرا کہ وہ جنگِ افغانستان کے بارے میں ایک ایسا فلمی مکالمہ تیار کر رہے تھے جس میں روس کو ایک اندھی طاقت کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔ ایک روسی منحرف اشتیفا پورے وثوق سے کہتے ہیں "سوویت حکومت میں اگر جرأت ہے تو ریفرنڈم کر کے دیکھ لے کہ عوام کی اکثریت افغانستان سے فوجی دستے واپس بلانے کے حق میں ہے۔ اس مداخلت کا عالمی تحریکِ انقلاب یا روس کی سلامتی سے کوئی تعلق نہیں"۔ لینن گراڈ کی ایک "جدید تحریک اشتراکیت" نے نومبر ۱۹۸۵ء میں اپنا منشور شائع کیا۔ دیکھو لگا دیں۔ ۲۲ جولائی ۱۹۸۶ء
"ہماری مسلح افواج تاریخ میں پہلی بار افغانستان میں ایک غیر اعلانیہ جنگ لڑ رہی ہیں

اسلام اور آزادی کے سوا کچھ نہیں۔ اس جنگ سے سوویت یونین یا مسلح افواج کے وقار میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔" "تحریک" کو شاید معلوم نہیں کہ روس نے آج تک کوئی اعلانیہ جنگ نہیں لڑی۔

لیتھونیا، لٹویا اور استونیا کی جمہوریتیں اہل افغانستان سے گہری ہمدردی رکھتی ہیں۔ افغانستان میں فوجی مداخلت کے ایک ماہ بعد ان ریاستوں کے اکیس[2] "تحریک پسندوں" نے سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کو ایک کھلا خط بھیجا۔ انھوں نے "سوویت افغان معاہدۂ دوستی" کا پول کھولتے ہوئے وضاحت کی۔ "بالٹک کے ممالک نے ایک وقت میں روس کے ساتھ دوستی اور باہمی تعاون کا معاہدہ کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ان معاہدوں کی آڑ میں روس اپنے فوجی دستے لے آیا۔ یہاں کے مفتوح عوام روس کے ساتھ دوستی کے تلخ نتائج اب تک بھگت رہے ہیں۔"

جنگ افغانستان نے وسط ایشیا پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اسلام دشمن پروپیگنڈے کے باوجود یہاں افغان مجاہدین سے گہری ہمدردی پیدا ہو گئی ہے۔ سرحد کے دونوں جانب ایسی قومیں آباد ہیں جو نسل اور مذہب کے لحاظ سے ایک رشتے میں منسلک ہیں۔ متعدد رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ افغان مجاہدین وسط ایشیا جا کر اپنے بھائی بندوں سے ملاقاتیں کرتے اور لٹریچر بانٹتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں وسط ایشیا کا دورہ کرنے والے ایک مغربی سیاح نے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا "ابھی بعد پتہ چلا کہ روسی افغان سرحد کتنی غیر محفوظ ہے۔ افغان گوریلے بلا روک ٹوک روس میں داخل ہوتے ہیں۔ پہلے وہ یہاں صرف اپنا لٹریچر لاتے تھے۔ اب منشیات اور ہتھیار تک لانے لگے ہیں۔ انھیں مقامی لوگوں کا پورا تعاون حاصل ہے۔" وسط ایشیا میں سوویت یونین کے خلاف خفیہ مواد شائع ہونے لگا ہے۔ ایک روسی اخبار نے تسلیم کیا کہ اس کے پیچھے افغان گوریلوں کا ہاتھ کارفرما ہے۔

وسط ایشیا میں جنگ افغانستان کے اثرات تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ اسلامی جذبے کی روح پھر بیدار ہو گئی ہے۔ مسجدیں نمازیوں سے بھرنے لگی ہیں۔ لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو رہے ہیں۔ کئی خفیہ تنظیمیں بن گئی ہیں جن کی قیادت "ملاؤں" کے ہاتھ میں ہے۔ سمرقند میں مقیم ایک سابق افغان طالب علم نے ایک رسالے [illegible] کو اکتوبر ۱۹۸۸ء کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا "قازق، ترکمان، ازبک، تاجک جمہوریتیں جو اصل

اسلامی ریاستیں ہیں۔ روس کی غلامی کا جوا اتار پھینکنا چاہتی ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت افغانوں سے ہمدردی رکھتی ہے۔" آذربائیجان جمہوریہ سے فوجی بھرتی اسی لئے ختم کر دی گئی ہے کہ وہاں کے نوجوان آتے ہی یہاں کے فوجی مجاہدین سے جا ملتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ۷۰۰ تاجک فوجیوں کا دستہ جنگ کے محاذ پر بھیجا گیا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ وہ افغان بھائیوں کے خلاف صف آرا ہیں تو انھوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ یہ فوجی واپس بھیج دیئے گئے۔ بعض کو ان کے افسروں کے حکم پر گولی مار دی گئی۔

۱۹۸۵ء میں ایک جرمن صحافی نے افغانستان میں ایک روسی تاجک بھگوڑے سے ملاقات کی۔ تاجک نے جرمن صحافی کو بتایا۔ "ہمارے نوجوان اپنے افغان بھائیوں کا خون نہیں کر سکتے۔ روسی افسر انہیں جبری طور پر بھرتی کر کے افغانستان پہنچا دیتے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ جنگ میں کام آنے والے وسط ایشیا کے مسلمانوں کو وہیں افغانستان میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ رشتہ داروں کو ان کی موت کی خبر تک نہیں دی جاتی۔"

۱۹۸۶ء کے وسط میں تاجکستان کے شہر دوشنبے سے پانچ افراد پکڑے گئے۔ وہ افغانستان پر روس کے قبضے کے خلاف پوسٹر تقسیم کر رہے تھے۔ ایک الزام یہ بھی لگایا گیا کہ وہ عوام کو جنگ کے لئے ہلاک ہونے والے فوجیوں کی تعداد بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ یو۔ ایس۔ ایس۔ آر۔ نیوز بریف (شمارہ ۵، ۱۹۸۴ء) کے مطابق ان افراد کا افغان گوریلوں سے رابطہ تھا۔ ۱۹۸۶ء میں اسی شہر دوشنبے سے ایک خاتون صلوا دیموف کی گرفتاری عمل میں آئی۔ الزام یہ تھا کہ وہ جنگ افغانستان کے خلاف ایک دستخطی مہم چلا رہی تھیں۔ انہیں بعد میں دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ روسی حکام تسلیم کرتے ہیں کہ وسط ایشیا میں صرف ایک گوریلا تنظیم حزب اسلامی کے تقریباً ۳۰۰ قومی ارکان موجود ہیں جو علاقے اور تاجکستان میں حکومت کے خلاف پوسٹر شائع کرتے رہتے ہیں۔ (ایکاریو۔ یو ایس ایس آر نیوز بریف شمارہ ۶، ۱۹۸۶ء)

جون ۱۹۸۸ء میں ازبکستان کے چالیس نوجوانوں نے افغانستان میں فوجی خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر ہنگامہ ہوا، فوجی دستے موقع پر بلائے گئے، فائرنگ کا زبردست تبادلہ ہوا جس کے نتیجے میں ۱۱ افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ افغانستان نے روس کے اندر ایک دھماکہ خیز صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اگر یہ جنگ مزید جاری رہی تو روس کی اندرونی سلامتی کے لئے ایک خطرہ بن جائے گی۔

(۱ کلاس ایکو پروٹوکول انٹیلیجنس بروشر شمارہ ۱۹۸۷ء، بحوالہ ترجمان القرآن جنوری ۱۹۸۸ء)

الحاج کاکا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ

موت تو ہر شخص کے لیے مقدر ہے اور اپنے متعین وقت پر آکر ہی رہتی ہے لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی وفات سے ایک بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ جناب الحاج کاکا محمد عمر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ ان کا سانحۂ ارتحال پوری ملت کے لئے ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔

خاندان اور پرورش

مرحوم جنوبی ہند کے مشہور "کاکا" خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ خاندان جنوبی ہند میں علم دوستی، علماء پروری اور تجارت کے لئے مشہور ہے۔ مرحوم کے جد امجد کاکا محمد عمر علیہ الرحمہ ایک بڑے تاجر ہونے کے ساتھ ساتھ علماء کی صحبتوں سے کسب فیض کے نتیجہ میں کافی دینی معلومات رکھتے تھے اور علم کتاب و سنت کی اشاعت، بدعات و خرافات کے ازالے اور گروہی و فقہی تعصبات کے خاتمے کے لئے برابر کوشاں رہے۔

مرحوم کی پرورش ان کے والد محترم کاکا محمد اسمٰعیل علیہ الرحمہ نے کی جو بڑے خدا ترس اور نیک انسان تھے۔ مرحوم کو پیار سے لوگ "عمر بابو" کے نام سے بلاتے تھے۔ عمر بابو کی تعلیم اگرچہ انگریزی ہوئی تھی لیکن گھریلو تربیت، شوق مطالعہ اور علماء کی صحبتوں کے ذریعہ انھوں نے کافی دینی معلومات حاصل کر لی تھیں اور دینی موضوعات پر بڑے اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔

جامعہ دارالسلام کی سرپرستی

مرحوم کے جد امجد کاکا محمد عمر علیہ الرحمہ، جو ایک بڑے تاجر تھے اور ملک و بیرون ملک شہرت رکھنے والی "روشن کمپنی" کے مالک تھے جس کا مرکزی دفتر شہر مدراس میں تھا، طبقۂ علماء سے ان کے بڑے روابط تھے۔ تجارتی مصروفیات سے وقت نکال کر علماء کرام کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے اور ان کو خاطر طلب استفادہ بھی کرتے۔ ملت کی زبوں حالی سے وہ بہت متاثر تھے اور یہ سمجھتے تھے

اس کی اصل وجہ کتاب و سنت سے دوری اور فروعی و جزئی اختلافات میں بے جا تحزب و تعصب ہے۔ مدارس عربیہ میں رائج نصاب تعلیم سے وہ بالکل غیر مطمئن تھے کیونکہ اس میں کتاب و سنت کو مرکزیت حاصل نہ تھی اور اس پر منطق و فلسفہ کی ایسی چھاپ تھی کہ خالص نحو و صرف اور اصول فقہ کی کتابیں بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ تھیں۔ فقہ کی تعلیم اس طرح ہوتی تھی کہ فقہی و مسلکی تعصب کو تقویت حاصل ہوتی تھی نیز عصری علوم کی جانب بالکلیہ بے اعتنائی تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر وہ نصاب تعلیم میں انقلابی اصلاح کے آرزومند تھے اس کے لئے انھوں نے بڑی کوششیں کیں لیکن مدارس عربیہ کے ارباب حل و عقد پرانی ڈگر چھوڑنے اور انقلابی اصلاحات قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے انھوں نے خود ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ نصاب تعلیم کی تیاری کے لئے مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دیگر اساطین علم سے مشورہ کیا اور ایک متوازن نصاب تعلیم تیار کروایا جس میں کتاب و سنت کو مرکزی حیثیت دی گئی۔ فلسفہ و منطق کی غیر ضروری کتابوں کے بوجھ کو ختم کیا گیا، تاریخ و ادب کے عنصر کو شامل کیا گیا۔ فقہ کی تعلیم کا ایسا خاکہ تیار کیا گیا جس سے تعصب کی جگہ مختلف مسالک کے درمیان رواداری پیدا ہو سکے نیز نصاب میں انگریزی زبان اور عصری علوم کے عناصر کو بقدر ضرورت و گنجائش داخل کیا گیا۔

اس نصاب تعلیم کو زیر عمل لانے کے لئے انھوں نے ریاست تمل ناڈو کے ضلع شمالی آرکاٹ کی ایک چھوٹی سی بستی "عمرآباد" کے پرسکون و پرکیف ماحول میں ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں مدرسہ "دارالسلام" قائم کیا جس نے بہت جلد جامعہ دارالسلام عمرآباد کے نام سے عالم گیر شہرت حاصل کر لی۔ مدرسہ میں تدریسی خدمات کی انجام دہی کے لئے انھوں نے ملک کے مختلف گوشوں سے ماہرین علوم کو اکٹھا کیا۔ مدرسہ کے قیام کے تین سال بعد ہی بانی محترم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے لائق صاحبزادے کاکا محمد اسمٰعیلؒ نے اپنے چچا کاکا عبدالرزاقؒ کے تعاون سے مدرسہ کی ذمہ داری سنبھالی اور پوری زندگی مدرسے کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ جس باغ کو ان کے والد بزرگوار نے بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ لگایا تھا، اس کی آبیاری کے لئے انھوں نے اپنا خون جگر پیش کیا۔ ان کے زمانے میں مدرسے نے بڑی ترقی کی اور تعلیم و تربیت کا معیار بہت اونچا ہوا۔ ستر سال کی عمر میں ۱۹۵۹ء میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے بعد جامعہ دارالسلام کو "عمر بابو" جیسی عظیم شخصیت کی سرپرستی

اور قیادت نصیب ہوئی جس نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور انتھک محنتوں سے جامعہ کو ترقی کے بام عروج تک پہنچا دیا۔ علم پروری اور انتظامی صلاحیتیں انھیں ورثہ میں ملی تھیں اور اس پر مستزاد فکر اور جذبۂ عمل جس نے ان کی شخصیت کے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔

اوصاف وخصائل

اللہ رب العزت نے مرحوم کو حیرت انگیز اوصاف اور خوبیوں کا مالک بنایا تھا۔ معاملہ فہمی، اصابت رائے، عزم واستقلال، حاضر دماغی، حق گوئی وبیباکی، علماء نوازی، خدا ترسی وبیداری، غرباء پروری، سیاسی بصیرت غرض کون سی ایسی خوبی تھی جو مرحوم میں بدرجہ اتم موجود نہ تھی۔ ذیل میں ہم مرحوم کی چند نمایاں صفات کا ذکر الگ سے کرتے ہیں۔

تواضع وانکساری

ایک بڑے تاجر اور عظیم دانش گاہ کے سربراہ ہونے کے باوجود مرحوم انتہائی متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ علماء واساتذہ سے بڑی شفقت واپنائیت کے ساتھ ملتے۔ اپنی شخصیت کے اردگرد انھوں نے ایسا کوئی حجاب نہیں حائل کیا تھا کہ لوگوں کو ان سے ملنے میں تامل ہو۔ ہر شخص آسانی کے ساتھ ان سے مل سکتا تھا اور اپنی بات ان سے کہہ سکتا تھا۔ مہمانوں کی خدمت کے لئے اس طرح بچھ جاتے کہ مہمان شرمندگی محسوس کرنے لگتے۔

پختہ عزم وحوصلہ اور مضبوط قوت ارادی

مرحوم بڑے عزم وحوصلہ کے انسان تھے۔ جو بات طے کر لیتے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پوری طرح کمربستہ ہو جاتے۔ مرحوم کے عزم وحوصلے کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم قلب کے مریض تھے اور کئی بار شدید حملہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ مکمل آرام کریں لیکن ڈاکٹروں کی ہدایات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مرحوم مسلسل کاموں میں مصروف رہتے اور جب کبھی اعزہ وبہی خواہان اس جانب توجہ مبذول کراتے تو عزم وحوصلے کا پیکر موصوف شان سے جواب دیتا کہ خدمت دین ہی تو حاصل زندگی ہے۔ یہ نہ ہو سکے تو پھر کس کام کے لئے زندگی کو سنبھال کر رکھا جائے۔

حرکت وعمل

”خرم بابو“ درحقیقت حرکت وعمل ہی کا دوسرا نام تھا۔ بے پناہ

جذبۂ عمل رکھتے تھے اور مسلسل کام کرتے رہتے۔ جامعہ کے لئے ملک وبیرون ملک کے طویل اسفار کرتے اور جب سفر سے واپس آتے تو بغیر آرام کئے جامعہ کے مسائل کی طرف فوری توجہ کرتے۔ تعلیمی وتربیتی حالات کا جائزہ لیتے اور تمام امور کا جائزہ لے کر ہدایات دیتے۔ لوگ انتہائی حیرت واستعجاب کا اظہار کرتے کہ کس طرح عارضۂ قلب میں مبتلا یہ پیکر استقلال وعزیمت ہمہ وقت متحرک رہتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا گویا کام کرنا ہی ان کے لئے آرام ہے۔ ان کے جذبۂ عمل اور قوت کارکردگی کو قریب سے دیکھنے والا ہر شخص اس بات کا اعتراف کرتا کہ اتنا سرگرم وفعال منتظم جس ادارے کو میسر آجائے ترقی کی شاہراہ پر برق رفتاری کے ساتھ اس کا گامزن ہونا لازمی ہے۔

مرحوم کی انہی صفات کی وجہ سے جامعہ نے ان کے عہد میں ہمہ جہتی ترقی کی۔ ان کے عہد کو بجا طور سے جامعہ کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ جامعہ کے تعلیمی وتربیتی معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی خواہش ہمیشہ ان کے دل میں موجزن رہتی اور جوہر قابل کی تلاش میں وہ ہمیشہ سرگرداں رہتے۔ ملک وبیرون ملک سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی خدمات انھوں نے جامعہ کے لئے حاصل کیں۔ ان کے عہد کا ایک نمایاں کارنامہ سنہ [illegible] میں جامعہ کے جشن طلائی کا انعقاد ہے جو جامعہ کے لئے ایک اہم تاریخی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جس کے بعد جامعہ میں مختلف نئے علمی شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔ ادارہ تصنیف وتالیف اور معہد التعریف بالاسلام وغیرہ قائم ہوئے۔ جامعہ کے متعدد تعمیری منصوبوں کو مرحوم نے اپنی انتھک محنت کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ ایک بڑا اسپتال تعمیر ہوا۔ کیمپس میں ایک شاندار مسجد بنی اور تعمیرات کے اضافے سے جامعہ خوشنما ہو گیا۔

مرحوم دنیا بھر میں جاری احیاء اسلام اور اشاعت دین کے لئے سرگرم عمل اسلامی تحریکات سے بڑا گہرا ربط وتعلق اور انتہائی عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ ان کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کرتے اور ان کی کانفرنسوں اور اجتماعات میں شریک ہوتے۔ تحریک اسلامی ہند سے بھی انھیں بڑا تعلق خاطر تھا اور ہر طرح سے اس کے تعاون کے لئے تیار رہتے۔ جب بھی دہلی آتے مرکز ضرور تشریف لاتے۔ خود جامعہ میں مختلف تقریبات کے موقع پر خطاب کے لئے تحریک اسلامی کے رہنماؤں کو مدعو کرتے۔ اسلامی تحریکات سے ان کی عقیدت ومحبت کا اندازہ اس واقعہ سے

لگایا جاسکتا ہے کہ مصر کے جابر و ظالم حکمرانوں نے جب احیائے اسلام کے لیے سرگرم عمل تحریک "الاخوان المسلمون" کے عظیم قائد سید قطبؒ کو تختہ دار پر لٹکا کر جام شہادت نوش کرنے کا موقع فراہم کیا اس موقع پر دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ہفت روزہ "ریڈینس" میں شہید مرحوم کی ایک مسکراتی ہوئی تصویر شائع ہوئی جس کے نیچے علامہ اقبالؒ کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

مرحوم نے جب اسے دیکھا تو آبدیدہ ہو گئے اور جب وہ منظر ان کے پردۂ ذہن پر تازہ ہوتا ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطروں کے ذریعہ شہید مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے۔

مرحوم اپنے سینے میں ملت کے لیے ایک تڑپتا ہوا دل رکھتے تھے اور ملت کی زبوں حالی سے سخت مضطرب تھے۔ ملی خدمت کے لیے ہمیشہ حاضر رہتے۔ ملی انتشار اور گروہی تعصبات کے خاتمے کے لیے برابر کوشش کرتے۔ مسلکاً اہلحدیث ہونے کے باوجود انتہائی روادار اور وسیع الظرف تھے۔ تمام مسالک کے علماء سے ان کا ربط و تعلق تھا اور ان کی خواہش تھی کہ ملت کے اندر یگانگت اور رواداری کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے تاکہ ملی اتحاد وجود میں آسکے۔

اس ضمن میں جامعہ دارالسلام نے جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں وہ لائق ستائش ہیں۔ الحمد للہ آج یہاں مختلف مسالک کے مدرسین و طلبہ یکجا رہتے ہیں اور ان کے درمیان بے نظیر رواداری رہتی ہے اور ایک خاندان کے افراد کی طرح سب باہم مل جل کر خوش و خرم رہتے ہیں۔ جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کا یہ طرز عمل مدارس عربیہ کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ہے اسی رواداری کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ مختلف مسالک کے مدارس الگ الگ قائم ہو گئے ہیں جہاں عموماً ایسی فضا ہوتی ہے کہ دوسرے مسلک کے فرد کے لیے اس میں سانس لینا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالعموم مدارس عربیہ سے فارغین کی ایسی کھیپ تیار ہو کر نکلتی ہے جو ملت کے اندر اتحاد و یگانگت کے جذبات ابھارنے کے بجائے تعصب و نفرت کے پودے لگاتی ہے۔

باقی ص ۲۹ پر

تعارف و تبصرہ

ولی اللہ مجیدی فلاحی

"غلبۂ اسلام"

مصنف: راشد شاذ
کتابت: عمدہ، طباعت: معیاری، صفحات: ۸۰
کاغذ: بہترین، ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف مسلم افیئرز
پی او بکس ۷۷، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ انڈیا

راشد شاذ صاحب کا تعارف میں کیا پیش کروں جب کہ میں خود آپ کی شخصیت سے متعارف نہیں۔ ہاں، بالواسطہ ملاقات کا شرف آپ کی دو کتابوں کے ذریعہ حاصل ہو چکا ہے۔ ایک زیر تبصرہ کتاب "غلبۂ اسلام" اور دوسری "بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان" ویسے دونوں کتابوں میں آپ کی تحریروں کے درمیان ایک ایسا باحوصلہ نوجوان کا بے باک چہرہ عیاں ہوتا محسوس ہوتا ہے جس کے دل میں اقامت دین، احیائے کلمۃ اللہ اور غلبۂ اسلام کے جذبات کا ایسا بحر بیکراں موجزن ہے جو چھلکا چاہتا ہے اور ماضی کا جائزہ اور عصر حاضر کا مشاہدہ اسے مزید بیکل کیے دے رہا ہے۔ نتیجۃً ہندوستان کی موجودہ صورت حال، غلبۂ اسلام کی تڑپ، اصلاحی تحریکات کا جائزہ، احیائی مشن کا نیا منصوبہ، جدید ہندوستان میں باطل کے مراکز، ماحاصل، جدید ہندوستان میں قوت اسلامی کے مراکز، مسلم تنظیمیں، مسلم قیادت، اسلام کے حمایتی اور باطل کو کیسے اکھاڑ پھینکا جائے جیسے موضوعات پر بڑی گراں قدر کوششیں سپرد قلم کر کے ہندوستان میں احیائے اسلام کا ایک ایسا منشور پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے ذریعہ (بقول مصنف) نہایت قلیل مدت میں اسلام کو غالب کیا جاسکتا ہے۔ الحمد للہ آپ کے احساسات پاکیزہ، خیالات سچے اور جذبات نہایت عمدہ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام کے باوجود آپ فکری ژولیدگی کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ یوں کہ ایک طرف تو آپ ہندوستان میں اسلامی انقلاب کے لیے فوری انقلاب کے خواستگار اور اس کی خاطر عوام کی گرم خونی کے طلب گار معلوم ہوتے ہیں تو دوسری طرف کچھ ہی دیر بعد امت مسلمہ کے فکری اختلاف اور تفریق و تقسیم کو دور کرنے، افکار و خیالات اور اذہان و قلوب بدلنے کے لیے عقائد کی زبان میں اسلام کے

مختلف پہلوؤں پر علمی اور شائستہ لٹریچر تیار کئے جائے، حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کے لئے مختلف ذرائع استعمال کرنے اور دور جدید کے ترقی یافتہ علمی و فکری وسائل کو استعمال کرنے کی باتیں کرنے لگے ہیں جس کو حاصل کرنے اور بروئے کار لانے کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ اسی طرح ایک طرف دینی و اصلاحی تحریکات کا تذکرہ فرماتے وقت بعض دینی تحریکات کو محض رسمی قرار دے کر ان کا مقصد صرف نعرہ بازی کرنا اور مخصوص اصطلاحات کو گھڑنا قرار دیتے ہیں۔ پھر خیال آتا ہے تو ان کی قابل قدر خدمات کو بلا تردید سابق تسلیم بھی کرتے ہیں دوسروں کو ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ کا درس دیتے ہیں لیکن آپ کی جھولی اس سے یکسر خالی نظر آتی ہے۔ مزید برآں علمائے اسلام میں تو بلی خاور نہیں کے برابر ہیں اور فہرست مفادین کو بالکل ہی نظر انداز کر دی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت کسی نہ کسی حد تک مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکی ہے۔ دین کو غالب کرنے کے لئے آپ نے جو منشور اور منصوبہ پیش کیا ہے وہ کوئی نیا منصوبہ نہیں دور حاضر کی بعض تحریکات کے پاس ایسا ہی ایک منظم منصوبہ پہلے سے موجود ہے جس کو عملی جامہ پہنانے میں وہ مصروف ہیں۔ اللہ رب العزت آپ کی نیت خالص کرے، ہندوستان میں اسلام کو غالب کرے اور ہم تمام کو اپنے دین اسلام کا خادم بنائے۔ آمین۔

غزل

محمد و فن کی مشق سے تم اہل فن ہو جاؤ گے
سچ اگر بولو گے رسوائے زمن ہو جاؤ گے

خاک کر ڈالو جلا کر ایک اک گل کو مگر
کام لو حکمت سے معمارِ چمن ہو جاؤ گے

شغل تیغ و سر بنا دیتا تمہیں آہن صفت
لاڑ سے ہو گل بدن سے، گلبدن ہو جاؤ گے

کیوں لرزتے ہو پتنگو تم دمِ طوفِ چراغ
خاک تو ہو جل کے، جانِ انجمن ہو جاؤ گے

ابتقا کی راہ کو بھی لازم ہے حد اعتدال
ورنہ اک دن شہر بنتے بَن ہو جاؤ گے

شیخ جی فتووں سے یہ اخلاص کچھ تقویٰ نہیں
یوں سا تو تم بھی لقمۂ زہر فتن ہو جاؤ گے

کون پھر پوچھے گا ثاقب خار ہائے دشت کو
جب تمہی شیدائی سرو و سمن ہو جاؤ گے

(ثاقب)

ولی اللہ سعید کی فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

۱۹۸۸ء کے فارغین جامعہ کو الوداعی پارٹی

۲۴ مارچ ۸۸ء بروز جمعرات کو اس سال کے فارغ ہونے والے طلبہ کو جامعہ کی طرف سے الوداعی پارٹی دی گئی۔ اس میں تمام اساتذہ اور کارکنان جامعہ شریک تھے۔ سب سے پہلے استاذ محترم صدر جامعہ جناب مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی نے کارروائی کا آغاز فرماتے ہوئے کہا: "آپ حضرات کو معلوم ہے کہ یہ تقریب عربی ہفتم کے طلبہ عزیز کی الوداعی تقریب ہے۔ یہ موقع خوشی کا بھی ہے اور غم کا بھی۔ غم کا اس لحاظ سے ہے کہ وہ طلبہ جو ہمارے درمیان ایک عرصے سے رہ رہے تھے، یہاں پڑھ رہے تھے اور تربیت پا رہے تھے۔ اب یہاں سے فراغت حاصل کر کے اپنے گھروں کو رخصت ہونے والے ہیں لیکن خوشی کا پہلو غم کے اس پہلو کو دبا دیتا ہے۔ اس ادارے کا مقصد آپ تمام کے سامنے ہے۔ اس کے اساتذہ اور اس کا تعلیمی نظام، اس کے تمام شعبہ جات طلبہ کی تعلیم و تربیت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان ساری تگ و دو، محنت و جانفشانی کا آپ حاصل ہیں۔ آپ کو دیکھ کر ہمیں اور سارے منتظمین جامعہ کو خوشی ہوتی ہے۔ ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہمارے طلبہ بیش از بیش علم و عمل، اخلاق و کردار سے آراستہ و پیراستہ ہو کر یہاں سے نکلیں اور امت سے خود بھی مستفید ہوں اور خلق خدا کو بھی استفادہ کا موقع دیں۔ اگر ہم آپ طلبہ کی تعلیم و تربیت میں کامیاب ہو گئے تو فبہا اور یہ محض اللہ کی توفیق ہی سے ہو سکتا ہے اور اگر ہم کما حقہ اس کا حق ادا نہ کر سکے تو یہ ہماری اپنی کوتاہی ہے۔"

عزیز طلبہ! آپ نے جو کچھ یہاں سے سیکھا ہے یہی سب کچھ نہیں ہے۔ یہاں کی اساتذہ نے حالات اور وسائل کے تحت جو کچھ آپ کو سکھایا جا سکتا تھا سکھا دیا گیا ہے۔ علم ایک ایسا سمندر ہے جو بے انتہا ہے۔ ہمالیہ علم کی چوٹی ایورسٹ تک پہنچنا اور وہاں علم کا پرچم لہرانا آپ اپنے پیش نظر رکھیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔

اس کے بعد جناب مولانا مفتی عبد الرؤف صاحب منصف پوری نے اپنے دل کی ترجمانی مندرجہ ذیل قطعہ تبریک کی شکل میں کی۔

ابھی باقی ہیں اس منزل کے آگے منزلیں کتنی
تمہیں چلنا ہے آگے زندگی کے آخری دم تک

نہیں غفلت سے چونکو، تازہ دم ہو کر بڑھو آگے
نہ رہ جائے کوئی منزل بھی اب دامن میں ہم تک

تہِ دل سے یہ منصف بھی مبارکباد دیتا ہے
تمہاری جہد پیہم پر یہ تم کو داد دیتا ہے

اس کے بعد فارغین جامعہ کا تعارف ہوا۔ تعارف کے بعد جناب مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا "ہمارے جو عزیز فارغ ہو کر جا رہے ہیں۔ انھیں نصیحت ہے کہ انھوں نے جو کچھ یہاں پڑھا ہے اس کا عملی نمونہ بنیں گے کیونکہ عالم اسے نہیں کہتے جس کے پاس علم کا خزانہ ہو بلکہ عالم وہ ہے جس کے پاس علم کے ساتھ عمل بھی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض بنیادی اور ابتدائی چیزوں کی طرف خاص طور سے توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ ہر ایک سے سلام کرنے میں پہل کریں خندہ پیشانی اور شگفتہ روئی کے ساتھ آپ ہر ایک سے ملیں اور نماز و تلاوت کا اہتمام آپ کا طرۂ امتیاز ہو۔

پھر جناب مولانا منیر حسن صاحب اصلاحی نے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "آپ جامعۃ الفلاح میں آئے جو ایک دینی درسگاہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حصول دین کی خاطر آپ نے اپنے گھروں کو چھوڑا اور یہاں آکر رہنا گوارا کیا۔ ایک دینی درسگاہ میں رہنے والا انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ دین کے علاوہ اور کیا ہے۔ آپ نے یہاں علم دین ہی تو حاصل کیا ہے۔ اس کے مطابق آپ حامل علم دین ہو گئے۔ اب آپ یہاں سے جائیں گے آپ کا سابقہ دو طرح کے لوگوں سے پڑے گا، ایک دیندار طبقہ، خدا کرے آپ کا سابقہ دینداروں سے زیادہ ہو۔ آپ ان کے ساتھ رہ کر اپنے آپ کو تولئے کہ آپ ان سے دینداری میں کہیں کم تو نہیں ہیں۔ آپ ان سے نیکی میں مسابقت کریں۔ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون۔
دوسرا طبقہ دنیادار طبقہ ہے۔ آپ یہ ہرگز نہ سوچیں کہ آپ ان سے کمتر ہیں۔ دین اور دنیا میں بہتر جو چیز ہے وہ آپ کی جھولی میں ہے۔ اسلئے عزیزو، دنیا کی قدروں پر کبھی رشک مت کرنا اسکے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض

ہو کر مجھ سے میرے ساتھیوں سے آپ کے حقوق کی ادائیگی میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں آپ اس پر عفو و درگذر کی چادر ڈال دیں گے۔"

اسکے بعد جناب مولانا شبیر احمد صاحب اصلاحی نے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ شیطان تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دیکھنا وہ کبھی تمہیں بہکانے نہ پائے، ہر مقام پر فتح تمہاری ہو۔

اسکے بعد ماسٹر قاضی زین العابدین صاحب نے انگریزی زبان میں فارغین سے کہا کہ اخلاق و کردار کی سب سے زیادہ اہمیت ہے اگر اخلاق و کردار کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو گویا ہر چیز ہاتھ سے چھوٹ گئی آپ ہر جگہ بہترین اخلاق و کردار کا مظاہرہ کریں۔

حسن اتفاق کہ اس نشست کے اختتام سے قبل جناب مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی صاحب تشریف لے آئے۔ آپ نے طلبہ کے اصرار پر انھیں نصیحت کی۔ آپ نے فرمایا جامعہ اپنے فکر، مزاج، اپنی تعلیم اور طرز تعلیم کی وجہ سے دوسرے اداروں سے ممتاز ہے آپ نے اس ادارے سے جو فکر حاصل کیا ہے وہ متاع گرانمایہ ہے ہر کسی کو نہیں ملتا۔ امید ہے آپ اسکی قدر کریں گے۔

آخر میں فارغ ہونے والے طلبہ کی نمائندگی کرتے ہوئے برادر عبد البر اثری نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں تعلیم کی تکمیل کا موقع عنایت کیا۔ اس موقع پر میں اپنے تمام ساتھیوں کی طرف سے آپ تمام اساتذہ کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ کی شان میں ہم سے گستاخیاں ہوئی ہیں ہم آپ سے معافی کے خواستگار ہیں۔ اور یقین رکھتے ہیں کہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی آپ ہماری رہنمائی فرماتے رہیں گے۔

اسکے بعد جناب مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کی دعا پر اس نشست کا اختتام عمل میں آیا۔

اسمائے فارغین طلبہ

۱: عبد البر اثری دربھنگہ۔ ۲: شفیق احمد، اعظم گڑھ۔ ۳: محمد عمر نیپال۔ ۴: ریاض الدین، نیپال۔ ۵: عبد اللہ ترابی، اعظم گڑھ۔ ۶: شمس احمد، اعظم گڑھ۔ ۷: امتیاز احمد، اعظم گڑھ۔ ۸: یوسف ار، اعظم گڑھ۔ ۹: اقبال حسن طیب، مظفر نگر۔ ۱۰: عبد الکریم احمد آباد۔ ۱۱: جاوید احمد، بستی۔ ۱۲: ضیاء الدین ملک، گیا۔ ۱۳: مشتاق احمد، بستی۔ ۱۴: نذیر احمد کشمیر۔ ۱۵: مناظر علی حبیب قادری، دہلی۔ ۱۶: فیاض احمد، اعظم گڑھ۔ ۱۷: صبغۃ اللہ عمر، ...

۱۸: سراج احمد، بستی۔ ۱۹: عبدالقیوم، بستی۔ ۲۰: عبدالحئی، نیپال۔ ۲۱: رضا کریم، بھاگل پور۔
۲۲: فیاض احمد، گڑھی، عمرآباد۔

جامعہ میں تعطیل

۱۱ر اپریل کو سالانہ امتحانات ختم ہو چکے ہیں۔ طلبہ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ البتہ اساتذہ کرام نتائج امتحانات کی تکمیل کے پیش نظر ۱۱ اپریل تک جامعہ ہی میں ٹھہر جائیں گے۔ سالانہ تعطیل ۲۴ر شعبان (۱۲ر اپریل) تا ختم ۷ر شوال (۲۴ر مئی) ۱۹۸۸ء رہے گی۔ ۸ر شوال (۲۵ر مئی) کو ان شاء اللہ جامعہ دوبارہ کھلے گا۔

جامعہ میں داخلے کے خواہش مند حضرات اپنی درخواستیں جامعہ کے مطبوعہ فارم پر تحریر فرما کر اس طرح روانہ کریں کہ وہ ۱۵ر رمضان المبارک تک دفتر جامعہ لازماً پہنچ جائیں۔

جناب کاکا محمد عمر صاحب کی غائبانہ نماز جنازہ

۹ر مارچ ۸۸ء کو جناب کاکا محمد عمر صاحب جنرل سکریٹری جامعہ دارالسلام عمرآباد کا ریاض میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تکلیف دہ خبر جناب مولانا محمد طاہر صاحب عمری مدنی استاذ جامعہ نے بعد نماز عشاء دارالسلام سے موصول ہونے والے کسی خط کے حوالے سے سنائی۔ مولانا نے مرحوم کے سلسلے میں تعزیتی کلمات کہنے کے بعد آپ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے اور جامعہ دارالسلام کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین۔

جامعہ کی مجلس انتظامیہ کا اجلاس

سابقہ سالوں کی طرح اس سال بھی اختتام سال کے موقع پر مجلس انتظامیہ کا اجلاس ہو رہا ہے۔ اس اجلاس کے انعقاد کی تاریخ ۷، ۸ر اپریل ہے۔

جامعہ کے مکتبہ میں کچھ نئی کتابوں کا اضافہ

ماشاء اللہ جامعہ کے مکتبہ میں چند ایام قبل تقریباً ۲۸۰ کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، لغت اور نحو کے فنون پر مشتمل ہیں۔ چند اہم کتابیں یہ ہیں: الجواہر فی تفسیر القرآن، محاسن التاویل للقاسمی، تاریخ ابن خلدون، التاریخ الکبیر للبخاری، معجم الادباء، معجم المؤلفین وغیرہ۔

مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی کی آمد بحیثیت استاذ جامعہ

اللہ کا شکر ہے کہ مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی بحیثیت استاذ جامعۃ الفلاح تشریف لا چکے ہیں۔

آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں حاصل کی۔ پھر جامعۃ المعارف رام پور سے دورۂ حدیث کیا۔ اس کے بعد تقریباً ۱۲ سال جامعہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ کی شخصیت علمی اور تحریکی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ خصوصاً جامعہ سے تعلق رکھنے والا ہر فرد آپ کو جانتا پہچانتا ہے۔ طلبہ سے آپ کی شفقت و محبت اور جامعہ میں آپ کی مقبولیت کے سلسلے میں کچھ لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے ہم معنی ہوگا۔

جامعہ میں ۱۲ سال تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد آپ نے تکمیل تعلیم کی غرض سے سعودی عرب کا رخ کیا اور وہاں کی مشہور و معروف یونیورسٹی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ الریاض میں ماجستیر (ایم اے) کا کورس کیا۔ چونکہ آپ کو قرآن اور علوم قرآن سے شروع سے ہی دلچسپی رہی ہے اس لئے آپ نے وہاں علوم القرآن ہی کو اپنے مضمون (SUBJECT) کی حیثیت سے منتخب کیا۔ آپ کے ماجستیر کی تھیسس کا عنوان تھا "امعان النظر فی نظام الآی والسور"۔

اس کے بعد آپ نے وہیں سے دکتوراہ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے دکتوراہ کی تھیسس کا عنوان تھا "البرہان فی نظام القرآن"۔ یہ تھیسس فل اسکیپ سائز کے ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ اب آپ تقریباً دس سال بعد اپنے خلیے کے درمیان دوبارہ تشریف لائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہم لوگوں کو آپ سے بیش از بیش استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

۱۹۸۸ء کے فارغین جامعہ کو انجمن طلبہ قدیم کی جانب سے استقبالیہ

۱۰ر اپریل کو بعد نماز عصر امسال فارغ ہونے والے طلبہ کو انجمن کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا۔ سکریٹری انجمن جناب جاوید اشرف صاحب فلاحی کے افتتاحی کلمات کے بعد جناب مولانا فضل احمد اصلاحی…

... نے فرمایا کہ جامعۃ الفلاح ایک تحریکی ادارہ ہے اس کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو باطل کے چیلنج کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔ انجمن طلبۂ قدیم کا مقصد جامعہ کے اغراض و مقاصد کے حصول میں اس کا تعاون کرنا ہے۔ اللہ کا شکر ہے آپ نے اس سال جامعہ سے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور ہمارے کارواں کے نئے ہمسفر ہونے جا رہے ہیں۔ آپ اپنے مقصد کو پہچانیں اور علم جیسی عظیم نعمت کی قدر کریں اس علم سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور بندگان خدا کو بھی استفادہ کا موقع فراہم کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔ آمین۔

اسکے بعد جناب مولانا شیخ اللہ صاحب نے فارغین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ نے آپ کو الوداع کہا ہے اور ہم آپکا استقبال کر رہے ہیں۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج دنیا آس لگائے ہوئے ہے کہ آپ آئیں اور اسکی رہنمائی کریں جذب ... دوری محسوس کرتے ہوئے دین اسلام کی نشر و اشاعت میں تن من دھن سے لگ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمکو اپنے مقصد میں کامیاب کرے آمین۔

اسکے بعد برادر عبدالبر اثری نے فارغین کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ انشاء اللہ ہم اپنے مقصد کے حصول میں اپنے مجرب بھائیوں کے تعاون کے ساتھ جان توڑ کوشش کریں گے ہمیں آپکی رہنمائیوں کی ضرورت ہے۔

آخر میں جناب مولانا محمد عمران صاحب فلاحی کی دعا پر یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

ساحل بھارتی

غزل

وہ چلنے کا ہے جشن تاج شاہانہ مجھے — کر دیا فکر جہاں نے بیگانہ مجھے
محرف آسے گا تری دنیا دل پر اس طرح — خالی خالی ساقیا تو دے نہ پیمانہ مجھے
اب وہ بجلی سی کہاں ساقی کی چشم التفات — پھیکا پھیکا لگ رہا ہے رنگ میخانہ مجھے
نرگس و لالہ وہ چپ کو صبا میر اسلام — لے چلے گلشن سے اب تو شوق دیوانہ مجھے
چاند نے ... کو ... اتنا ... ہے کیوں — اے خرد تیری ادا لگتی ہے طفلانہ مجھے
رنج و غم کب ہے ... نشاط و سرخوشی — تو نے جو بخشا ہے انداز کریمانہ مجھے
جب چراغ انجمن جلتا ہے میرے خون سے — کیوں سر محفل اب وہ کہتے ہیں بیگانہ مجھے
اس چمن میں غنچہ و گل کس طرح مسلے گئے — خون دل سے اے صبا لکھنا ہے افسانہ مجھے

دیکھنا اک دن بدل دوں گا نظام میکدہ
مل گیا ہے اب تو ساحل ذوق رندانہ مجھے

بلریاگنج میں

سوئیوں کی واحد دوکان

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
روزے دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی افطار کے وقت ہوتی ہے اور دوسری اپنے رب سے ملاقات کے وقت ہوگی۔ (بخاری)

رمضان المبارک اور عید الفطر کے اس سعید موقع پر ہم آپ کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں

- مناسب قیمتوں کے ساتھ ہر قسم کی عمدہ سوئیاں ہمارے یہاں فراہم ہیں
- تھوک بھاؤ والے تاجر ہوں یا انفرادی خریدار۔ ہم آپ تمام کا استقبال کرتے ہیں۔

صرف ایک بار خدمت کا موقع دیں

رابطہ کیلئے

نثار احمد سوئیں پروڈیوسر۔ میڈیکل اسٹور، جامعہ نگر، بلریاگنج، اعظم گڑھ